سہ ماہی کاروانِ ادب لکھنؤ

مرکزی دفتر رابطہ ادب اسلامی (عالمی)

شعبۂ برصغیر، لکھنؤ (انڈیا)

سہ ماہی

کاروان ادب

جلد-۲۷ | اپریل، مئی، جون ۲۰۲۰ء | شمارہ-۱

مجلس مشاورت

• مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی • مولانا حافظ فضل الرحیم • ڈاکٹر محمود الحسن عارف • مولانا محمد سلطان ذوق ندوی

مشرف عام

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

صدر رابطہ ادب اسلامی شعبۂ برصغیر

مدیر تحریر

ڈاکٹر محسن عثمانی ندوی

نائب مدیر

مولانا جعفر مسعود حسنی ندوی

معاون تحریر : مولانا نذر الحفیظ ندوی

مجلس ادارت

• ڈاکٹر شفیق احمد ندوی، دہلی • ڈاکٹر تابش مہدی، دہلی • ڈاکٹر سید ضیاء الحسن، لکھنؤ • مولانا محمد الیاس بھٹکلی ندوی، بھٹکل

معاون انتظامی اقبال احمد ندوی

-: زرتعاون :-

اس شمارہ کی قیمت: ۵۰ روپے، سالانہ برائے ہندوستان ۲۰۰ روپے پاکستان و بنگلہ دیش: ۳۰۰ روپے یا ۱۰ امریکی ڈالر ان کے علاوہ دیگر ممالک: ۴۰۰ روپے

چیک یا ڈرافٹ اس نام سے بنائیں

RABITA-AL-ADAB-AL-ISLAMI(INDIA)

-: صدر دفتر :- رابطہ ادب اسلامی (عالمی) پوسٹ بکس ۹۳، ندوۃ العلماء، لکھنؤ

Designed & Printed at : Mashhud Enterprises Lko. Mob. 9839133588, 9451947786

مشمولات

پیشِ نظر شمارہ کاروانِ ادب

ابتدائیہ	حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی	۳
اداریہ: ناموس قلم	پروفیسر محسن عثمانی ندوی	۴
ولؔی دکنی اردو شاعری کا باوا آدم	مولانا محمد سہیل ندوی	۸
دینی مدارس کے چند مشاہیر اور ان کا ذوقِ ادب	مولانا شاہ اجمل فاروق ندوی	۱۵
سعدؔی شیرازی، انسانی اقدار کا شاعر	پروفیسر محمد حسان خان	۲۲
انسانیت کی خدمت میں مختلف اصنافِ ادب کا حصہ	مولانا محمد شعیب کوٹی	۲۷
ادب کی تاریخ میں اردو کے ممتاز ادیب اور نثر نگار	پروفیسر محسن عثمانی ندوی	۳۲
انشائیہ - تُہمتِ مختاری	محمود عالم قریشی	۷۱
غزل	حامؔد یزدانی	۷۸
غزل	حامؔد یزدانی	۷۹

ابتدائیہ

محمد رابع حسنی ندوی
صدر رابطہ ادبِ اسلامی

الحمد للّٰہ رب العالمین، والصلاۃ والسلام علی سید المرسلین و خاتم النبیین محمد، وعلی آلہ وصحبہ أجمعین وبعد:

محبت اور نفرت کا عمل دل اور دماغ دونوں کے اثر سے ہوتا ہے، یہ عمل زندگی کے عملی پہلو سے بھی ہوتا ہے اور قولی پہلو سے بھی۔قولی لحاظ سے ذریعہ انسانی زبان بنتی ہے، انسانی زبان میں عام اور سادہ بات کہنے کی صلاحیت بھی ہوتی ہے اور دل ودماغ پر اثر ڈالنے کی بھی صلاحیت ہوتی ہے۔دونوں مقصد اپنے اپنے موقع پر اپنا کام کرتے ہیں اور دونوں میں سے کسی کو بھی ذریعہ بنایا جاسکتا ہے۔زبان کا ذریعہ ان میں سے جس مقصد کے لیے اختیار کیا جائے، وہ اس کی ترجمانی کرتا ہے۔اچھائی اور برائی اس میں نتیجے کے طور پر سامنے آتی ہے۔

زبان کو اس کی ادبی اثر پذیری کے لحاظ سے استعمال کرنے میں صاحبِ کلام کی مرضی شامل ہوجاتی ہے، وہ اگر اچھی مرضی ہو تو اچھا فائدہ ہوتا ہے اور اگر مضرت کے تحت استعمال ہو تو اچھا حال پیدا نہیں کرتی ہے اور زبان کو جب ادبی واثر پذیری کے انداز میں استعمال کیا جاتا ہے تو بڑی کارگر ہوتی ہے۔ انسانی تاریخ میں ادب سے بہت کام لیا جاتا رہا ہے اور اس کے ذریعے انسانی معاشرے پر اثر ڈالا جاتا رہا ہے، جس میں اس کے ذریعہ مقصدِ عمل میں دل پسندی اور کبھی ناگواری پیدا ہوئی، اس طرح ادب کبھی غنچہ وگل اور کبھی تلوار بھی ہے کہ اس سے اچھا کام لیا جاسکتا ہے اور مضر بھی، اس سے ادب کی افادیت اور اس کی مضرت کی نشاندہی ہوتی ہے۔

ہم ادب کے لیے جب ''اسلامی'' کی صفت استعمال کرتے ہیں تو اسلام نے ہم کو خیر پسندی کی جو تلقین کی ہے، وہ مراد لیتے ہیں، یہ خیر پسندی اسلام کی تعلیماتِ زندگی کے تمام پہلوؤں میں پھیلی ہوئی ہے، ضرورت ہے کہ ہم تحریروں اور تقریروں میں اس کا لحاظ کرنے کا اہتمام رکھیں، تمام خیر پسند لوگوں کا اور ہمارے ندوہ کا بھی یہی پیغام ہے۔

تاریخِ انسانی کے علم وادب کی تاریخ میں دونوں کی اپنی اپنی کارگزاری ملتی ہے، جب بات عقلی حقیقت کے مطابق کہی جائے تو وہ علم کے تحت ہے اور جب اس میں ادبی رنگ وڈھنگ شامل کردیا جائے تو پھر وہ اپنے ادبی ڈھنگ سے کام کرتا ہے۔انسانوں کی تمدنی وثقافتی ترقی کی صورت میں ادب وعلم دونوں ایک دوسرے سے بغل گیر ہوتے رہے ہیں اور دونوں آپس میں خلط ملط ہوکر بھی چلے ہیں، یعنی اصحابِ غرض نے اپنے اپنے من مانے طریقے سے حقائق کو پیش کیا ہے، ایسی صورت میں اصل حقیقت سے واقف ہونے میں دشواری بھی ہوئی ہے اور صحیح رہنمائی میں فقدان ہوا ہے، عربوں کا ادب اسلام کی آمد سے متصل پہلے اور آغاز عہد میں صاف اور حقیقت کا ترجمان ہوتا تھا اور عربوں کے حال وقال سے صحیح طور پر حقیقت شناسی کرتا تھا، اور پھر جب ان میں علم کی بغل گیری زیادہ بڑھی تو دونوں کے اختلاط سے واقعاتِ زندگی کی صحیح ترجمانی پر اثر پڑا، یہ بات الگ ہے کہ کس حد تک اچھا اثر پڑا اور کس حد تک برا اثر پڑا۔

اداریہ

ناموسِ قلم

پروفیسر محسن عثمانی ندوی

ایک اچھے صاحبِ قلم کو ہمیشہ اپنے قلم کا پاس اور اُس کی آبرو کا احساس رہتا ہے اور وہ اپنے احسان کا اظہار اس طرح کرتا ہے:

''میرے پاس متاع صرف ایک قلم ہے، قلم جو چوبِ خضر بھی ہے اور گیسوئے عالم ایجاد کا شانہ بھی ہے، جہاں ماضی موت کے ایوانوں میں ابدی نیند میں گم ہوجاتا ہے، اسی کو قلم کتب خانوں میں زندہ رکھتا ہے، قلم کی نوک کے آگے تلواروں کی دھار کند ہوجاتی ہے، قلم اگر موجِ تخیل کو الفاظ کی تنگ بانہوں میں سمیٹ دیتا ہے تو روح کاغذ کے مسامات میں بھر دیتا ہے، قلم کی جنبش میں شعور کی لرزش بھی ہے، اس کی ٹھوکر میں شاہوں کے تاج اور اقتدار پسندوں کے سر ہیں، قلم ایک سطر میں سوشہر آباد کردے تو الفاظ کے طاق میں افکار کی قندیل کی روشنی کردیتا ہے، سب سے معتبر گواہی اگر قلم کی ہے تو اس کی سیاہی صبحِ صادق کی سفیدی ہے''۔

(روزنامہ سیاست ۱۵/اگست ۲۰۰۸)۔

متاعِ لوح وقلم جس انسان کو مل جائے وہ اُس انسان سے زیادہ باعظمت اور باقیمت ہے جس کے پاس قارون کا خزانہ اور سیم وزر کا انبار ہو۔ لوح وقلم کے شرف اور افتخار کے لیے کافی ہے کہ قرآن مجید میں اللہ تعالی نے اس کی قسم کھائی ہے، قرآن میں نون کی (حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کی تفسیر دوات سے کی ہے) اور قلم کی اور قلم سے جو تحریریں وجود میں آتی ہیں ان کی قسم کھائی گئی ہے: ﴿ **نون والقلم وما یسطرون** ﴾ اور قران کی پہلی وحی میں قلم کا تذکرہ اس طرح موجود ہے کہ اللہ نے قلم کو علم کی اشاعت کا ذریعہ بنایا ہے ﴿ **علم بالقلم** ﴾۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے قلم پیدا کیا اور اس کے لکھنے کا حکم دیا۔ پھر اس نے کائنات کی تخلیق کی۔ (ابن جریر طبری) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قلم انسانی تہذیب کے ارتقا کی خشتِ اول اور علمِ اشیا کی جہانگیری کی شرطِ اولین ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جب دوات اور قلم اور نگارشاتِ قلم کی قسم کھائی ہے تو چند لفظوں کے بعد آپ (ﷺ) کو مخاطب کرکے کہا ہے کہ آپ خلقِ عظیم کے منصب پر فائز ہیں، اس سے قلم اور اخلاق کے رشتے کا بھی اندازہ ہوتا ہے، اور اس سے اس بات کا پیغام ملتا ہے کہ اگرچہ کہ قلم آلۂ تبلیغ وترسیل ہے لیکن صاحب

قلم کو ناموسِ قلم کا ہر حال میں پاس ولحاظ رکھنا چاہئے اور قلم سے اخلاق وشرافت کے خلاف کوئی بات نہیں لکھنی چاہئے۔

اگر کوئی شخص اپنے قلم سے دوسروں کی آبرو ریزی، کردار کشی اور دل شکنی کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اسے اس بارِ امانت کا اندازہ نہیں جو قلم کی بدولت اسے بخشا گیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ علم کی دولتِ عزت کا وہ مستحق نہیں اور قلم اس کے ہاتھ میں ایسا ہی ہے جیسے کسی شریر بدقماش لڑکے کے ہاتھ میں پستول، جس طرح سے ایسے نانہجار لڑکے کے ہاتھ سے پستول چھین لینا درست ہے، ویسے ہی دوسروں کی عزت سے کھیلنے والے اور سب کی پگڑیاں اچھالنے والے شخص کے ہاتھ سے قلم چھین لینا ہی انسانیت کی خدمت ہے، قلم کے غلط استعمال کے مہلک اخروی نتائج کا اگر صاحبِ قلم کو اندازہ ہوجائے تو وہ صفحۂ قرطاس پر سب سے عفو ودرگزر کا طالب ہوگا تاکہ قصۂ زمین برسرِ زمین ختم ہوجائے اور کوئی آخرت میں اس کا گریبان نہ پکڑ سکے۔

قلم سے فاسد افکار اور غلط نظریات کی تنقید کا کام لینا چاہئے نہ کہ اسے انسانوں کو بے حرمت کرنے کا وسیلہ بنانا چاہئے، قلم کی قسم کھانے کے بعد اللہ نے جس ذات کے اخلاق عالیہ کی گواہی دی ہے اس نے اپنی پوری زندگی میں مسلمانوں کے معاشرے میں نام لے کر کسی پر تنقید نہیں کی، کسی برائی پر نکیر کرنی ہوتی تو آپ اس طرح تقریر میں کہتے کہ کیا بات ہے لوگ ایسی ایسی حرکت کرتے ہیں، نام لے کر کسی پر تنقید نہیں کرتے تھے۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ قیامت کے دن ایسے شخص کو لایا جائے گا جس نے بہت عبادت کی ہوگی لیکن اس کے ساتھ کسی کا دل بھی دکھایا ہوگا، کسی کی توہین کی ہوگی، کسی پر کوئی اتہام رکھا ہوگا اور کسی کی غیبت کی ہوگی، آخر میں اس کی نیکیاں ان لوگوں کو دے دی جائیں گی جو اس کی تیغ زبان کے زخم خوردہ تھے، پھر تیغ زبان سے دوسروں کو زخمی کرنیوالے شخص کو جہنم میں جھونک دیا جائے گا، اور اس کی ساری عبادت اور ریاضت رائگاں چلی جائے گی۔

ایک جگہ پریس کانفرنس ہورہی تھی، اصل فارسی شاعر نے غزل کے شعر میں تو لفظ قدم استعمال کیا تھا لیکن مولانا علی میاں نے صحافیوں اور صاحبانِ قلم کو نصیحت کرتے ہوئے اور کردارکشی سے پرہیز کرنے کی تلقین کرتے ہوئے ان کے سامنے لفظ قدم کو بدل کر قلم کا لفظ اس طرح استعمال کیا تھا:

آہستہ خرام بلکہ مخرام
کہ زیر قلمت ہزار جان است

اگر ایک طرف ایک صاحبِ قلم اپنے قلم کا غلط مصرف لے کر دوزخ کی آگ خریدتا ہے تو دوسری طرف دوسرا صاحبِ قلم اپنے قلم کا صحیح استعمال کر کے جنت الفردوس کا وارث ہوسکتا ہے۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ نوعِ انسان میں قابلِ رشک صرف دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں ایک وہ لوگ جن کو اللہ نے مال دیا اور وہ اپنے مال کو کارِ خیر میں خرچ کرتے ہیں۔ دوسرے وہ لوگ جن کو اللہ نے علم وحکمت سے نوازا اور وہ

اپنے قلم کی بدولت صحیح فیصلے کرتے ہیں اور دوسروں کو علم وحکمت کا درس دیتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ علم وحکمت کا درس زبان سے بھی دیا جاتا ہے اور قلم سے بھی دیا جاتا ہے، اور قلم کے ذریعہ جو درس دیا جاتا ہے وہ زیادہ پائدار ہوتا ہے اور صدیوں تک لوگ اس سے استفادہ کرتے ہیں۔ امام غزالی، ابن تیمیہ، جلال الدین رومی، شاہ ولی اللہ دہلوی کی کتابیں آج بھی پڑھی جاتی ہیں اور صدیاں گذرنے کے بعد بھی ان کا فیض قلم کی بدولت جاری اور ساری ہے۔ قلم ایک امانت ہے اور قلم چلانے والے ہاتھ کو اقدارِ عالیہ اور ضمیر کا پابند ہونا چاہئے۔ اسے کسی دباؤ کے تحت قلم کا غلط استعمال نہیں کرنا چاہئے اور حاکم ظالم کو بھی صاف کہہ دینا چاہئے کہ قلم ایک امانت ہے، اسے طاقت سے توڑا تو جاسکتا ہے، موڑا نہیں جاسکتا۔

جو لوگ اپنے قلم کا صحیح استعمال کرتے ہیں وہ اپنے قلم سے اچھے اور مفید خیالات کی اشاعت کرتے ہیں اور غلط افکار ونظریات کی کاٹ کرتے ہیں، وہ سوسائٹی کے معزز ترین لوگ ہوتے ہیں، ضرورت پیش آنے پر وہ قلم سے تلوار کا کام لیتے ہیں اور اسی مفہوم میں کہا گیا ہے کہ قلم تلوار سے زیادہ طاقتور ہے Pen is mighter than sword تلوار سے سر قلم کیے جاتے ہیں، تلوار کا وار جسم پر پڑتا ہے، قلم سے غلط اور فاسد خیالات پر ضرب لگائی جاتی ہے اور اس کا اثر انسان کے دل اور دماغ پر پڑتا ہے۔ یہ صاحبانِ قلم اشخاص کے خلاف نہیں لکھتے بلکہ ان غلط اور مسموم نظریات کے خلاف لکھتے ہیں جن کی وہ ترجمانی کرتے ہیں، ان کو ابوجہل سے بیر نہیں ہوتا ہے بلکہ اس جہل سے بیر ہوتا ہے جس کی وہ نمائندگی کرتا ہے ۔جہل کے پھیلاؤ پر صبر کرنا ان کے لیے مشکل ہوجاتا ہے اور وہ یہ کہہ کر قلم ہاتھ میں لیتے ہیں کہ ۔

ضبط کروں میں کب تک آہ چل رے خامہ بسم اللہ

قلم سے قوموں کی ترقی ہوتی ہے، جہالت کے اندھیرے چھٹ جاتے ہیں، علم کا نور پھیل جاتا ہے، قلم کی قسم قرآن کریم میں یوں ہی نہیں کھائی گئی ہے، قلم کا پیشہ اختیار کرنا ناموسِ قلم کا لحاظ رکھنا ہر دور میں عزت اور عظمت کا نشان رہا ہے، قلم ذریعۂ حیات بھی ہے اور اس کا صحیح مصرف ہو تو وہ ذریعۂ نجات بھی ہے۔ دوسری زبانوں میں اربابِ قلم کو مال ودولت اور دنیوی عزت بھی حاصل ہوتی ہے۔ اس لیے فارسی شاعر نے کہا ہے کہ قلم کا یہ کہنا ہے کہ میں شاہجہاں ہوں اور صاحبِ قلم کو دولت سے مالا مال کردیتا ہوں۔

قلم گوید کہ من شاہِ جہانم قلم کش رابدولت می رسانم

لیکن یہ قلم ہر دور میں اپنی شکلیں بدلتا رہا ہے، کبھی شاخِ نبات سے، کبھی بانس سے، کبھی نرکل سے، کبھی مور کے پر سے قلم بنایا گیا ہے، کبھی اس کی شکل پنسل کی ہوجاتی ہے اور کبھی فونٹن پن کی، کبھی رفل کی، کبھی ٹائپ رائٹر کی اور اب کمپیوٹر کی ''کی بورڈ'' کی اس نے شکل اختیار کرلی ہے، علامہ ابن تیمیہ سے جب کاغذ اور قلم چھین لیا گیا تھا اور ان کو پسِ دیوارِ زندان ڈال دیا گیا تھا تو انہوں نے کوئلے سے جیل خانوں کی

دیواروں پر لکھنا شروع کر دیا تھا، کبھی شاعر خونِ دل میں بھی اپنی انگلیاں ڈبو لیتا ہے اور کبھی ہر حلقۂ زنجیر میں اپنی زبان رکھ دیتا ہے۔ مجنون سے جب قلم چھین لیا گیا تھا جب وہ صحرا میں قلم سے محروم تھا تو لوگوں نے دیکھا کہ وہ ریت کے ٹیلے پر بیٹھا ہوا عالمِ محویت میں ریگ زار پر ہر طرف لیلی کا نام لکھ رہا ہے، لوگوں نے جب اس سے استفسار کیا تو اس نے یوں جواب دیا۔

گفت مشقِ نامِ لیلی می کنم
خاطر خودراتسلی می دہم

قلم کبھی ابرِ گوہر بار ہوتا ہے اور کبھی تیغ جوہر دار ہوتا ہے، کبھی یہ ناموسِ وطن کا محافظ ہوتا ہے، کبھی حق کا پاسبان ہوتا ہے، کبھی ادبِ عالیہ کی تخلیق کا وسیلہ ہوتا ہے، اس کے بہت سارے کام ہیں۔ شورش کاشمیری کے چند اشعار پیش ہیں۔

صفحۂ کاغذ پہ جب موتی لٹاتا ہے قلم
ندرتِ افکار کے جوہر دکھاتا ہے قلم
بندگان ِعلم وفن کی خلوتوں کا آشنا
ان کے فکر وفہم کی باتیں سناتا ہے قلم
یادگاروں کا محافظ تذکروں کا پاسباں
گم شدہ تاریخ کے اوراق لاتا ہے قلم
شاعروں کے والہانہ زمزموں کی آبرو
دانش وحکمت کی راہوں کو سجاتا ہے قلم
اہلِ دل، اہلِ سخن، اہل ِنظر، اہلِ وفا
ان کے خط وخال کا نقشہ جماتا ہے قلم
چاک ہوتا ہے جگر شمشیرِ جوہردار کا
موج میں جب لوٗلوئے لالہ لٹاتا ہے قلم

قلم کے ذریعے جو علم کی روشنی پھیلائی جاتی ہے، وہ تاریخ کی پر پیچ راہوں کو روشن کرتی ہے اور انسانیت کے قافلے اس کی روشنی میں اپنا سفر طے کرتے ہیں، اس لیے قلم کا فائدہ زیادہ عام اور اس کا فیض مدام ہے۔ اسی لیے تحریر کو تقریر پر فضیلت حاصل ہے کیونکہ تحریر کی تنویر گردشِ شام وسحر کی زنجیر سے آزاد رہتی ہے۔ اسی لیے صاحبِ قلم کو اپنی قوت پر غرور ہوتا ہے اور اس لیے احمد فراز حاکمِ وقت کو خطاب کر کے اسے عظمتِ قلم کا احساس دلاتے ہیں۔

اسے ہے سطوتِ شمشیر پر گھمنڈ بہت
اسے شکوہِ قلم کا نہیں ہے اندازہ
میرا قلم نہیں کاسہ کسی سبک سر کا
جو غاصبوں کو قصیدوں سے سرفراز کرے
مرا قلم تو امانت ہے میرے لوگوں کی
مرا قلم تو عدالت مرے ضمیر کی ہے
اسی لیے تو جو لکھا تپاکِ جاں سے لکھا
جبھی تو لوچ کماں کا زبان تیر کی ہے
میں کٹ گروں کہ سلامت رہوں یقین ہے مجھے
کہ یہ حصار ِستم کوئی تو گرائے گا
تمام عمر کی ایذا نصیبیوں کی قسم
میرے قلم کا سفر رائیگاں نہ جائے گا

ولؔی دکنی اردو شاعری کا باوا آدم

مولانا محمد سہیل ندوی
نگینہ۔بجنور

ولؔی دکنی کے نام اور وطن کے بارے میں اختلاف ہے۔اہلِ گجرات اسے گجرات کا باشندہ ثابت کرتے ہیں اور اہلِ دکن کی تحقیق کے مطابق اس کا وطن اورنگ آباد دکن تھا' لیکن ولؔی کے اشعار سے دکنی ہونا ثابت ہے۔ ولی اللہ ولؔی سلطان عبداللہ قلی قطب شاہوں کے آٹھویں فرمانروا کے عہد میں ۱۶۵۰ میں اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ اس کے بعد حصولِ علم کے لیے احمد آباد آگیے جو اس زمانے میں علم وفن کا مرکز تھا۔وہاں حضرت شاہ وجیہ الدین کی خانقاہ کے مدرسے میں داخل ہوگیے۔ ولؔی کی عمر کا بیشتر حصہ احمد آباد میں گزرا۔ اس شہر کے فراق میں انھوں نے ایک پُر درد قطعہ بھی لکھا۔ولؔی نے گجرات ، سورت اور دہلی کا سفر بھی کیا۔ اس کے متعلق اشارے ان کے کلام میں موجود ہیں' لیکن ان کا سب سے مشہور سفر،سفرِ دہلی ہے۔

جس وقت دہلی میں ولؔی کی ملاقات سعد اللہ گلشن سے ہوئی تو وہ ان کا کلام سن کر بہت متاثر ہوئے اور انھوں نے ولؔی کو دومشورے دیئے: ایک تو یہ کہ دکنی الفاظ کا استعمال کم کرو اوران کی جگہ فارسی کے شیریں الفاظ کا انتخاب کرو۔ دوسرے یہ کہ فارسی شاعری میں جو مضامین موجود ہیں انھیں اپنی زبان میں ادا کرو۔ یہ دونوں مشورے اردو شعر و ادب کی تاریخ میں سنگِ میل ثابت ہوئے۔ فارسی شاعری کے مضامین سے پہلے بھی فائدہ اٹھایا جارہا تھا اور فارسی الفاظ بول چال کے مقامی الفاظ کے ساتھ پہلے بھی شیر وشکر ہورہے تھے'اب شاعری میں اس کا شعوری طور پر آغاز ہوا اور اس کی شروعات کا سہرا ولؔی کے سر ہے۔مولانا محمد حسین آزؔاد اپنی کتاب '' آبِ حیات'' میں لکھتے ہیں کہ:

> ''ولؔی نے ایک زبان کا دوسری سے ایسا بے معلوم جوڑ لگایا کہ آج تک زمانے نے کئی پلٹے کھائے مگر پیوند میں جنبش نہیں آئی۔ چنانچہ ولؔی کے دہلی سے لوٹنے کے انیس برس بعد جب ان کی غزلیں ان کے دیوان کے ساتھ دہلی پہنچیں تو اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور لوگ گلیوں میں اسے گاتے پھرتے۔ ولؔی کے کلام سے شعراء دہلی پہلے ہی واقف ہوچکے تھے مگر اب یہ دیکھ کر ان کی آنکھیں کھل گئیں کہ وہ گری پڑی زبان جسے اہلِ علم

حقارت سے ''ریختہ'' کہتے تھے اپنے اندر اتنے امکانات رکھتی ہے اور اس میں اتنی بلند پایہ شاعری کی جاسکتی ہے ۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہر طرف اس زبان میں شاعری کا چرچا ہوگیا''۔

فلسفوں کی گہرائیوں اور علمی مضامین و اخلاقی باتیں نہ ہونے کے باوجود ولیؔ کی شاعرانہ اہمیت مسلمہ ہے۔ جب بھی اردو غزل کی بات ہوگی اولیت کا تاج ولیؔ کے سر کی زینت بنے گا۔ وہ اردو غزل کا باوا آدم نہ سہی، غزل کو نئے معانی اور نئے راستوں پر ڈالنے کا معمارِ اول ضرور ہے۔ ولیؔ نے متعدد شعری اصناف میں طبع آزمائی کی لیکن غزل کو خاص طور پر اپنی توجہ کا مرکز بنایا اور اس کے دامن کو وسیع کیا۔ ولیؔ کی زبان سادہ اور سہل ہے لیکن اس سادگی میں حسن ہے۔ انھیں پیکر تراشی میں بڑی مہارت حاصل ہے۔ خوبصورت تشبیہیں و استعارے استعمال کرنے کا انھیں خوب سلیقہ ہے۔ اکثر صنائع و بدائع سے بھی کام لیتے ہیں اور خوش آہنگی نے بھی کلامِ ولیؔ کے حسن میں اضافہ کیا ہے۔

ولیؔ دکنی اردو شاعری کا باوا آدم

آبرو شعر ہے تیرا اعجاز
پر ولیؔ کا سخن کرامت ہے

تجھ مثل اے سراؔج بعدِ ولیؔ
کوئی صاحب سخن نہیں دیکھا

ایک طویل عرصے تک ولیؔ دکنی کو اردو کا پہلا غزل گو تسلیم کیا جاتا رہا لیکن بعد میں تحقیق سے یہ بات ثبوت کو پہنچ گئی کہ اردو غزل کا آغاز ولیؔ سے پہلے امیر خسرؔو سے ہی ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر وحید قریشی اس بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''ولیؔ سے پہلے کم از کم غزل کے دو ادوار گزر چکے تھے۔ ان ادوار کے شعرا کے کچھ نمونے بھی ملتے ہیں۔ پہلا دور امیر خسرؔو سے شروع ہوتا ہے جس میں دس شعرا ہیں۔ دوسرا دور قلی قطب شاہ سے شروع ہوکر میراں ہاشمی تک چودہ شاعروں پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد ولیؔ کے معاصرین کا زمانہ ہے۔ گویا یہ بات طے ہوگئی کہ اردو غزل کی خشتِ اول ولیؔ کے ہاتھوں نہیں رکھی گئی بلکہ ولیؔ سے صدیوں قبل غزل اپنی ابتدا کر چکی تھی تو پھر کس بنیاد پر کہا جاسکتا ہے کہ اردو غزل گو کی اولیت کا تاج ولیؔ کے سر پر رکھا جائے؟''۔

اس سلسلے میں ہمیں ''آبِ حیات'' میں مولانا محمد حسین آزادؔ کی ایک رائے پر غور کرنا ہوگا ، وہ اپنے مخصوص انداز میں لکھتے ہیں:

''یہ نظمِ اردو کی نسل کا آدم جب ملکِ عدم سے چلا تو اس کے سر پر اولیت کا تاج رکھا گیا جس میں وقت کے محاورے نے اپنے جواہرات خرچ کیے اور مضامین کے رائج الوقت دست کاری

سے مینا کاری کی''۔

ولؔی کے بارے میں ہمیں آزؔاد کے یہ تاثراتی اور ذاتی الفاظ اس بحث کا باعث بنے کہ ولؔی کو باوا آدم قرار دیا جائے یا نہیں؟ اگر اسے باوا آدم مان لیا جائے تو اس سے پہلے غزل گو کس کھاتے میں جائیں؟ اور اگر ان کو باوا آدم تسلیم نہ کریں تو ان کی شاعری میں کیا کمی آجائے گی؟ وغیرہ وغیرہ۔ اس سلسلے میں سب سے پہلی بات یہ ذہن میں آتی ہے کہ شاید آزؔاد کے زمانے تک ولؔی سے پہلے غزل گو شاعروں کے بارے میں تحقیق نہ ہوسکی تھی اور آزؔاد کو یہ بات قطعی معلوم نہ ہوسکی کہ ولؔی سے قبل ہی غزل گو بلکہ بعض اچھے شعرا موجود ہیں۔ اگر آزؔاد کا اس جملے سے یہی مطلب تھا تو یہ بات جدید تحقیقات کی روشنی میں بالکل غلط ثابت ہوچکی ہے۔ ہاں اگر آزؔاد کے ہاں اس جملے سے یہ تصور ہو کہ ولؔی سے قبل اردو شاعری کی روایت موجود تھی مگر اتنی پختہ نہ تھی اور ولؔی نے اسے ایک خاص شکل عطا کرکے ہمارے سامنے رکھا تو یہ بات ولؔی کو اردو شاعری کا باوا آدم ضرور ثابت کرتی ہے۔

ولؔی کو اس اعتبار سے یقیناً ہم باوا آدم کہہ کر اولیت کا تاج ان کے سر پر رکھ سکتے ہیں کہ انھوں نے اردو شاعری کی روایات ترتیب دیں، نہ صرف زبان بلکہ مضامین کی جدت ان کا کارنامہ ہے۔ ولؔی کے روپ میں اردو غزل کو پہلی مرتبہ ایسا شاعر ملا جس نے زبان کی پوشیدہ صلاحیتوں کو ابھارا اور نہ صرف اپنے دور کے تمام ادبی وفکری روایات کو شاعری کا حصہ بنایا بلکہ اظہار کی لذت اور زبان کی تعمیر کا اعجاز بھی دکھایا، اور اردو غزل کے اظہار کے موضوعات کا تعین کیا جو صدیوں تک غزل کا لازمہ سمجھے جاتے رہے ہیں۔ اردو غزل کے اظہار کے سانچے مرتب کیے اور زبان کے مختلف تجربات کے ذریعے ایسا شعری سرمایہ دیا جو غزل کی ترقی میں مددگار ثابت ہوا اور اس طرح ولؔی کے ہاتھوں غزل کی جاندار روایات کا قیام عمل میں آیا۔ ولی محمد صادق اس بارے میں لکھتے ہیں:

''ولؔی کی شاعری کے چار نہایت اہم پہلو ہیں: تاریخی، لسانی، فنی اور جمالیاتی۔ تاریخی لحاظ سے وہ اس وجہ سے اہم ہے کہ اس کے زیرِ اثر شمالی ہند میں جدید شاعری کا آغاز ہوا، اور رفتہ رفتہ یہ اسلوب تمام ملک پر چھا گیا، اس لیے اگر آزؔاد کے الفاظ میں اسے اردو شاعری کا باوآدم کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا''۔

ولؔی کی غزل گوئی

غزل کے سلسلے میں ولؔی کے اشعار کے چند نمونے حاضرِ خدمت ہیں:

کیا مجھ عشق نے ظالم کوں آب آہستہ آہستہ
کہ آتش گل کوں کرتی ہے گلاب آہستہ آہستہ
عجب لطف رکھتا ہے شبِ خلوت میں گل رو سوں
خطاب آہستہ آہستہ، جواب آہستہ آہستہ
ادا و ناز سوں آتا ہے وہ روشن جبیں ہر سو

کہ جیوں مشرق سے نکلے آفتاب آہستہ آہستہ
ولی مجھ دل میں آتا ہے خیالِ یارِ بے پروا
کہ جیوں انکھیاں میں آتا ہے خواب آہستہ آہستہ

ولی کو اردو کا سب سے پہلا با قاعدہ غزل گو تسلیم کیا جاتا ہے۔ ابتداءً ولی نے قدیم رنگ میں شاعری کا آغاز کیا تھا ۔مگر اپنے سفرِ دہلی کے دوران شاہ سعد اللہ گلشن کے مشوروں پر ریختہ گوئی کی ابتدا کی اور اسی میں عظمت و انفرادیت کا ثبوت دیا۔ یہیں سے ان کی شاعری میں ایک نئے باب کا آغاز ہوتا ہے۔ ان کی غزل گوئی کے جائزے کے بعد ان کی شاعری کی درج ذیل نمایاں خصوصیات کا تعین کیا جاسکتا ہے۔

ولی جمال دوست شاعر

ولی کی شاعری میں حسن و جمال کا موضوع بڑا اہم ہے۔ ولی سے پہلے کسی شاعر نے حسن و جمال کا بھرپور اور کامیاب تصور نہیں دیا۔ اسی لیے ڈاکٹر سید عبد اللہ نے ولی کو جمال دوست شاعر کا لقب دیا ہے۔ ان کی حسن پرستی میں سرمستی و وارفتگی کی لہر پیدا ہوتی ہے۔ ان کی حسن پرستی میں سرمستی و سرخوشی کا رنگ نمایاں محسوس ہوتا ہے۔ وہ حسن کو ایک تجربے کے طور پر قبول کرتے ہیں جس سے ان کی روح اور جسم میں سرمستی کی لہریں پیدا ہوتی ہیں۔ خود کو اس تجربے کے محسوسات میں گم کر دینا چاہتے ہیں۔ ان کی حسن پرستی صحت مندانہ انداز کی ہے۔ وہ حسن کو کسی ایسے تجربے کی بنیاد نہیں بناتے جو جنسی ہو اور جس سے صرف نفسانی خواہشات کا تعلق ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ولی کے ہاں جنسیت و احساساتِ حسن آفاقی تصورات کا حامل محسوس ہوتے ہیں۔ وہ حسن کے احساسات سے روح کی بالیدگی اور من کا سرور حاصل کرتے ہیں:

نکل اے دل رُبا گھر سوں کہ وقتِ بے حجابی ہے
چمن میں چل بہارِ نسترن ہے ماہتابی کا
آج گل گشتِ چمن کا وقت ہے اے نو بہار
بادہ گل رنگ سوں ہر بام گل لبریز ہے

زندگی اور کائنات کا حسن

ولی حسن و جمال کے شعری تجربات بیان کرتے ہوئے کسی غم یا دُکھ کا اظہار نہیں کرتے کیوں کہ وہ جمال دوست ہیں، اس لیے کائنات کی ہر شے میں جمال دیکھتے ہیں، ان کی نظر زندگی اور کائنات کے تاریک پہلوؤں کو نہیں دیکھتی ۔ وہ صرف روشن پہلوؤں کا نظارہ کرتی ہے، جہاں خوشی، امید اور مسرت کی سدابہار چھاؤں ہے۔ وہ حسن سے مایوس ہو کر آہیں بھی نہیں بھرتے، اس لیے کہ وہ بامراد عاشق ہیں اور محبوب کے حسن کا دیدار انھیں حاصل ہے۔ اور ان کی شاعری میں زندگی اور کائنات کا حسن بھی نظر آتا ہے۔ ولی حسن کے حوالے سے ایسی فضا قائم کرتے ہیں جہاں پر ہر طرف پھول ہی پھول اور وسیع سبزہ زار ہیں، شفاف اور ٹھنڈا پانی ہے ، پرندے چہچہا رہے ہیں، چاندنی کھلی ہوئی ہے، دور تک میدان اور راہ چاندنی میں نہائی ہوئی ہیں، پوری کائنات مسکراتی معلوم ہوتی ہے، جیسے فطرت کا تمام حسن ولی کے بیان میں سمٹ آیا ہے۔

ان اشعار کو دیکھیے جن میں ولی زندگی کے خوبصورت مظاہر ذکر کرتے ہیں:

صنم مجھ دیدہ و دل میں گزر کر
ہوا ہے ، باغ ہے ، آبِ رواں ہے
نہ جاؤں صحنِ گلشن میں کہ خوش آتا نہیں مجھ کو
بغیر از ماہ رو ہرگز تماشا ماہتابی کا

احساساتِ حسن کی شاعری

ڈاکٹر سید عبداللہ کے خیال میں ولی کی شاعری عراقی طرز سے زیادہ قریب تر ہے۔ اس عراقی طرز سے ان کی مراد یہ ہے کہ ولی کے ہاں معاملاتِ عشق کے بیان کے بجائے احساساتِ حسن کا بیان زیادہ ہے۔ وہ معاملاتِ عشق جن سے گفتگو، محبوب سے ملاقات اور مکالمے کا پہلو نکلتا ہے وہ سب ولی کی شاعری کا حصہ ہے۔

مسندِ گل منزلِ شبنم ہوئی
دیکھ رتبہ دیدۂ بیدار کا

ڈاکٹر سید عبداللہ ولی کے اس رجحان پر بحث کرتے ہوئے مزید لکھتے ہیں:

”ولی نے فکری گتھیاں نہیں سلجھائیں، انھوں نے چاند کی چاندنی، آفتاب کی حسرت انگیز دھوپ، سپہرِ نیل گوں کی دل کش وسعت اور صبح و شام کے دل آویز حسن کا تماشائی بننا اور ان سے حواسِ ظاہر و باطن کو مسرور بنانا سیکھا اور سکھایا ہے۔ ولی فلسفۂ زندگی کے ترجمان و شارح نہ تھے، بلکہ جمالِ زندگی کے وصاف اور قصیدہ خواں تھے“۔

تیرا لب دیکھ حیواں یاد آوے
تیرا مکھ دیکھ کنعاں یاد آوے
تیرے دو نین دیکھوں جب نظر بھر
مجھے تب نرگستاں یاد آوے
تیرے مکھ کی چمن کو دیکھنے سوں
مجھے فردوسِ رضواں یاد آوے

خوبصورت تشبیہات و استعارات

تشبیہ حسنِ کلام کا زیور اور شاعری کی جان خیال کی جاتی ہے۔ ولی کو تشبیہات کے استعمال کے معاملے میں اجتہاد کا درجہ حاصل ہے۔ ان کی شاعری کا نمایاں وصف ان کی خوبصورت تشبیہیں ہیں جو اپنے صحیح مواد پر انگوٹھی میں نگینے کی مانند خوبصورتی کے ساتھ جڑی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔

مسندِ گل منزلِ شبنم ہوئی
دیکھ رتبہ دیدۂ بیدار کا
تیری یہ زلف ہے شامِ غریباں
جبیں تیری مجھے صبحِ وطن ہے
دو آتش کیا ہے سرمۂ چشم
داغِ دل دیدۂ سمندر ہے

ان کی تشبیہات میں جو کیف، حسنِ ندرت، جدت، دل کشی اور دل آویزی ہے وہ محتاجِ بیان نہیں۔ پھول کی کھلی

ہوئی پنکھڑی کو ''دیدۂ بیدار'' کہنا، باحیا محبوب کے سینے میں راز کی مانند ولی کے گھر آنا، ''زلف کا شام غریباں'' اور ''جبیں کا صبحِ وطن'' ہونا اور دل کے داغ کا بمنزلہ ''دیدۂ سمندر'' ہونا ولی کی بے مثال فن کاری ہے اور چابک دستی کا منہ بولتا ثبوت ہے ۔ یہ تو صرف چند مثالیں ہیں۔ ولی کا پورا دیوان اسی قسم کی نادر تشبیہات سے سجا سنورا پڑا ہے۔

سوز و گداز

غزل چونکہ معاملاتِ مہر و محبت اور وارداتِ عشق و عاشقی کی داستان ہے، اس راہ کے مسافر کو قدم قدم پر ہجر و فراق کی تلخیاں سہنا پڑتی ہیں، کتنی رکاوٹیں عبور کرنا پڑتی ہیں، جی جی کر مرنا اور مر مر کر جینا پڑتا ہے، اس لیے ان واردات و تجربات کے بیان میں سوز و گداز کا عنصر لازمی طور پر شامل ہوتا ہے۔ ولی کی غزلوں میں سوز و گداز یقیناً موجود ہے مگر اس کی کیفیت میر کے سوز و گداز سے مختلف ہے، اس لیے کہ میر کے ہاں سوز و گداز کی شدت ہے، جب کہ ولی کے ہاں اس کے برعکس، سوز وگداز میں بھی ان کا احساسِ جمال کارفرما محسوس ہوتا ہے۔

اک گھڑی تجھ ہجر میں اے دل رُبا تنہا نہیں
مونس و دمساز میری آہ ہے ، فریاد ہے
نہ آئے اسے جگ میں ہرگز قرار
جسے عشق کی بے قراری لگے

زبان کی شگفتگی اور آہنگ

ولی ایک ذہین شاعر تھے، جنھوں نے مروجہ اظہار کے سانچوں کے جائزے کے بعد اپنی شعری بصیرت کی مدد سے اس بات کو محسوس کر لیا تھا کہ اس وقت مروجہ زبان اعلیٰ شاعرانہ خیالات کے اظہار کے قابل نہیں۔ چنانچہ انھوں نے خود زبان کے سانچوں کو مرتب کیا۔ ولی کی زبان ان سے پہلے کے غزل گو شاعروں سے قطعی مختلف محسوس ہوتی ہے، ان کی شاعری پڑھتے ہوئے اس تبدیلی کا نمایاں احساس ہوتا ہے۔ یہ زبان مقامی ہندی اور فارسی الفاظ کا ایک خوبصورت آمیزہ ہے۔ اس طرح ان کی زبان میں سلاست و شگفتگی کا عنصر نمایاں ہوتا ہے۔

مت غصے کے شعلے سوں جلتے کو جلاتی جا
ٹک مہر کے پانی سوں یہ آگ بجھاتی جا

چھوٹی اور لمبی بحروں کا استعمال

شاعری کے بہاؤ کو تیز کرنے اور ترنم کی لہروں کو بلند کرنے کے لیے ولی چھوٹی اور لمبی بحروں کا استعمال کرتے ہیں اور غنائیت و موسیقی کا وہ جادو جگاتے ہیں کہ ان کی فن کاری پر ایمان لانا پڑتا ہے۔

دیکھنا ہے ہر صبح تجھ رخسار کا ہے مطالعہ مطلعِ انوار کا
یاد کرنا ہر گھڑی اس یار کا ہے وظیفہ مجھ دلِ بیمار کا
شغل بہتر ہے عشق بازی کا کیا حقیقی و کیا مجازی کا

خارجیت کا تصور

چونکہ ولی جمال دوست شاعر ہیں ، اس لیے وہ داخلیت کے اندھیرے کنویں میں بند نہیں رہ سکتے، بلکہ ان کے ہاں خارجیت کا بھی بھرپور نظارہ ہے۔ وہ باہر کی دنیا کی

رنگینیوں سے لطف اندوز اور محظوظ ہوتے ہیں۔ ان کی آنکھیں زندگی اور کائنات کے حسن و جمال کا مسلسل مشاہدہ کرتی رہتی ہیں اور جہاں جہاں ان کے دیدۂ بینا کے لیے سامانِ نظارہ ملتا ہے وہ لطف و سرور حاصل کرتے ہیں۔ ان کی خارجیت بڑی نکھری ہوئی اور جاندار ہے، اس میں صرف خارج کے کوائف کے احوال ہی قلمبند نہیں کیے گیے بلکہ ولی کا ذاتی نقطۂ نظر ہر موقع پر موجود رہتا ہے۔ وہ کائنات کا مطالعہ اس کے تحت کرتے ہیں اور خارجیت کا بیان کرتے ہوئے حسن و جمال کے تصورات کو پیش پیش رکھتے ہیں۔

مجموعی جائزہ

بقول رام بابو سکسینہ:

''جب ولی کا نیرِ اقبال چمکا تو چھوٹے چھوٹے تارے جو افقِ شاعری پر اس وقت ضیا فگن تھے، سب ماند پڑ گیے، ولی کو ریختہ کا موجد، گویا اردو کا چاسر خیال کرنا چاہئے۔ اس زمانے میں اردو شاعری کا سنگِ بنیاد باقاعدہ طور پر رکھا گیا''۔

بقول حامد افسر:

''یوں تو ولی دکنی اردو شاعر کہلاتے ہیں، لیکن ان کے کلام کا بہت سا حصہ اس زبان میں بھی ہے جو فصیح مانی جاتی ہے اور ہمارے روزمرہ میں داخل ہے۔ گویا ولی نے اپنے زمانے سے ڈھائی سو برس بعد کی زبان کا صحیح اندازہ کر لیا تھا۔ ولی ایک حقیقی شاعر تھے جنھوں نے غزل گوئی کا حق ادا کر دیا''۔

بقول ڈاکٹر سید عبداللہ:

''حق یہ ہے کہ معاملات اور حکیمانہ گہرائی و دردمندی اور سوز و گداز کی کمی کے باوجود ولی کا کلام بڑا خوش رنگ اور خوش گوار ہے۔ بہار آفریں الفاظ، خوش صورت تراکیب، گلِ گلگشت کی تکرار، حسن کے ترانے اور نغمے، مناسب بحروں کا انتخاب اور اسالیبِ فارسی سے گہری واقفیت اور ان سے استفادہ ان سب باتوں نے ولی کو ایک بڑا رنگین شاعر بنا دیا ہے''۔

خوگر نہیں کچھ یونہی ہم ریختہ گوئی کے
معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا

مراجع و مصادر

☆ آبِ حیات -- مولانا محمد حسین آزاد۔ ☆ تاریخِ ادبِ اردو -- پروفیسر نور الحسن نقوی۔ ☆ تاریخِ ادبِ اردو -- ڈاکٹر جمیل جالبی۔ ☆ کلیاتِ غزلیاتِ ولی دکنی -- ادبی دنیا۔ ☆ انتخابِ ولی دکنی -- پروفیسر خالد ندیم / سید ظہیر الدین مدنی ☆ اردو غزل ولی تک -- سید ظہیر الدین مدنی۔ ☆ اردو کا پہلا شاعر پہلا مدون -- اویس احمد ادیب۔ ☆ دیوانِ ولی -- حیدر ابراہیم سایانی / ولی محمد۔ ☆ کلیاتِ ولی -- نور الحسن۔ ☆ ولی فن و شخصیت اور کلام -- ساحل احمد

دینی مدارس کے چند مشاہیر

اوران کا ذوقِ ادب

مولانا شاہ اجمل فاروق ندوی

فخرِ مشرق علامہ شفیق جونپوری نے کہا تھا:

مہرِ تاباں تو کرنیں ڈالتا ہے ذرّے ذرّے پر
چمک جاتا ہے جس میں ذوقِ استعداد ہوتا ہے

ذوق کیا ہوتا ہے؟ کس طرح پیدا ہوتا ہے؟ اِس میں نکھار کہاں سے آتا ہے؟ اِس کے کیا اثرات ونتائج ہوتے ہیں؟ اِن تمام سوالات کے جواب تفصیل طلب بھی ہیں اور ہمارے موضوع سے غیر متعلق بھی۔ البتہ اتنا طے ہے کہ مختلف حالات کے نتیجے میں کسی بھی چیز سے پیدا ہونے والی مناسبت ذوق کہلاتی ہے۔ اِس مناسبت میں جب ترقی ہوتی ہے تو وہ چٹخارے، چسکے اور لت کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اِس منزل پر پہنچنے کے بعد ہی انسان کسی میدان میں امتیاز حاصل کرتا ہے۔

ذوق کے اس مقام تک رسائی حاصل کیے بغیر انسان سے کسی کارنامے کی امید نہیں کی جاسکتی۔ لیکن ہمارے موجودہ اردو ادب اور بالخصوص اسلامی ادب کا ایک المیہ یہ ہے کہ یہاں ہر اردو بولنے اور سمجھنے والا خود کو ادیب سمجھ لیتا ہے۔ بے جھجک علمی و ادبی میدان میں اتر پڑتا ہے۔ نہ اسے اردو زبان وادب کے آغاز وارتقا کی تاریخ کا علم ہوتا ہے اور نہ اُس کے بنیاد گزاروں کا۔ نہ وہ اردو کے قدیم دبستانوں کی خصوصیات سے واقف ہوتا ہے اور نہ جدید نظریات سے۔ نہ اُس نے اردو زبان وادب کی تاریخ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھنے والی کتابوں کا مطالعہ کیا ہوتا ہے اور نہ شعر ونثر میں امامت کا درجہ رکھنے والی شخصیات کے شعری ونثری مجموعوں کا۔ اِن تمام نقائص کے باوجود وہ اس ادبی اسکول کا علم بردار ہوتا ہے، جو سب سے وسیع، ہمہ گیر، با مقصد اور دور رس ہے۔ یعنی ادبِ اسلامی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ علمی وادبی دنیا میں خود بھی کسی امتیازی مقام سے محروم رہتا ہے اور اسلامی ادب کی بدنامی کا بھی سبب بنتا ہے۔

ایسے ماحول میں سخت ضرورت ہے کہ ہم مشاہیرِ ادب کی زندگیوں پر نظر ڈالیں۔ دیکھیں کہ انھوں نے اپنے مقامِ بلند تک پہنچنے کے لیے کتنی تگ ودو کی؟ اپنے ذوق کی تشکیل اور نشو ونما کے لیے کیا کیا پڑھا اور کتنا پڑھا؟ شاعری اور نثر کی

کتنی مختلف الخیال شخصیات کو پڑھا، سمجھا اور ہضم کیا ؟ امید ہے کہ اِن سوالات کے جوابات موجودہ دور میں ادیب اور بالخصوص اسلامی ادیب کی ذمے داریوں کو واضح کرنے میں معاون ہوں گے۔ بزرگانِ ادب کی زندگیوں کی روشنی میں اپنے ذوق کی تشکیل و ارتقا کے فریضے کی ادائی کے لیے آمادہ کرسکیں گے۔ کیوں کہ اعلیٰ علمی و ادبی ذوق کے بغیر علم و ادب کی کوئی خدمت انجام نہیں دی جاسکتی۔

موضوع کی مناسبت سے ہم صرف مدارسِ عربیہ سے متعلق چند اہم شخصیات کے ادبی ذوق کی تشکیل کا جائزہ لیتے ہیں۔

علامہ شبلی

ادبِ اسلامی کے علم برداروں کے پاس شاعری میں سب سے بڑی شخصیت اقبال کی ہے اور نثر میں سب سے بڑی شخصیت شبلی کی۔ پوری اردو دنیا شبلی کو بالاتفاق اردو کے عناصرِ خمسہ میں شامل کرتی ہے۔ سیرت و تاریخ، فلسفہ و کلام، تعلیم، تحقیق اور تنقید کے میدانوں میں اُن کا کام اِس نوعیت کا ہے کہ آج ایک صدی گزر جانے کے باوجود اپنے اپنے موضوعات پر اُس سے بہتر کام وجود میں نہیں آسکا۔

علامہ شبلی نعمانی کے ادبی ذوق کی تشکیل و ارتقا کے متعلق علامہ سید سلیمان ندوی فرماتے ہیں:

مولوی عبداللہ صاحب موصوف بیان فرماتے تھے کہ مولوی شبلی میں بچپن ہی سے آثارِ کمال پائے جاتے تھے۔ ایک رات کو میں سو رہا تھا۔ قریب ایک بجے کا وقت تھا۔ یک بیک میری آنکھیں کھل گئیں۔ تو کیا دیکھتا ہوں کہ مولوی شبلی ایک گوشے میں بیٹھے ہوئے کچھ لکھ رہے ہیں۔ پوچھا تو معلوم ہوا کہ ایک قطعۂ تاریخ لکھ رہے ہیں''۔

(حیاتِ شبلی، ص:۷۱)

مولوی محمد عمر صاحب کے حوالے سے مزید لکھتے ہیں:

''بچپن میں وہ فرصت کے اوقات شہر کے ایک کتب فروش کی دوکان پر بسر کرتے تھے۔ کتابیں الٹتے پلٹتے اور شعرا کے دیوان پڑھتے اور مناسبتِ طبع سے اُن کے اچھے اشعار یاد رہ جاتے تھے''۔ (ایضاً)

آگے چل کر لکھتے ہیں:

''مولانا نے حماسہ گویا حفظ کرڈالا اور آخر عمر تک بلا ناغہ صبح کو حماسہ کے اشعار گنگنایا کرتے تھے۔ جمہرۃ العرب شعرائے جاہلیت کے قصائد کی دوسری کتاب تھی، جو مولانا فیض الحسن صاحب کے ذریعے سے اُن تک پہنچی اور پڑھی''۔

(حیاتِ شبلی، ص:۸۳)

’’مولانا کو سادہ عربی نگاری کا شوق جاحظ کی کتابوں سے پیدا ہوا تھا، جو انھیں علی گڑھ آنے کے بعد ملیں۔ مگر پھر بھی اُس کا تخم مولانا فیض الحسن صاحب ہی کی صحبت میں پڑ چکا تھا‘‘۔ (ایضاً)

علامہ عبد الحی حسنی

’’گلِ رعنا‘‘ اور ’’دلی اور اس کے اطراف‘‘ کے حوالے سے اردو زبان و ادب کی تاریخ میں علامہ عبدالحی حسنی کا نام ہمیشہ زندہ و تابندہ رہیگا۔ اُن کے ادبی ذوق کی تشکیل وارتقا کے متعلق کوئی مضبوط بات نہیں ملتی۔ مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی والدِ محترم کی وفات کے وقت صرف نو سال کے تھے۔ اِس لیے انھیں بھی اپنے والد سے اس سلسلے میں کوئی بات معلوم نہ ہوسکی۔ لہذا اُن کی کتاب ’’حیاتِ عبدالحی‘‘ اِس سلسلے میں خاموش نظر آتی ہے۔ البتہ ’’گلِ رعنا‘‘ کے مقدمے سے ایک اہم بات سامنے آتی ہے۔

علامہ عبدالحی حسنی نے ’’گلِ رعنا‘‘ کے مقدمے میں اپنے بارے میں خود لکھا ہے کہ تقریباً پچیس تیس برس کی عمر تک وہ بیاض لکھنے کا اہتمام کرتے رہے۔ اُس کے بعد زندگی کے مشاغل میں لگ کر یہ سلسلہ ختم ہوگیا۔ پھر ’’گل رعنا‘‘ کی تصنیف کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

’’سالِ گزشتہ میں صحت نے بے وفائی کی۔ سال کا سال مرض کے الجھاؤ میں گزر گیا۔ اس سال کچھ کام کرنے لگا تھا کہ پھر مرض کا اعادہ ہوا۔ مدتوں کی عادت پڑی ہوئی کتاب بینی اور تصنیف و تالیف طبیعتِ ثانیہ بن چکی تھی۔ مجبوراً طبیعت کو ایسی کتابوں کے مطالعے پر مائل ہونا پڑا، جن سے دماغ پر زور نہ پڑے۔ اِن ہی کتابوں میں وہ بیاض بھی نکل آئی، جو کسی زمانے میں ہر وقت پیشِ نظر رہتی تھی۔ دیکھنے سے معلوم ہوا کہ مشہور مشہور شاعروں کا کلام اِس میں اتنا جمع ہو چکا ہے کہ اگر اس کو ترتیب دے کر شائع کردیا جائے تو پڑھنے والوں کو اس میں دل چسپی ہوسکتی ہے۔ اسی کے ساتھ خیال ہوا کہ جن کا کلام ہو، اُن کے مختصر حالات بھی لکھ دیئے جائیں‘‘۔ (گل رعنا، ص:۳)

اِس کا مطلب یہ ہوا کہ گل رعنا کی موجودہ شکل تو یقیناً بعد میں سامنے آئی۔ لیکن اُس کی اساس اور اکثر شعری حصہ جوانی کے دنوں میں ہی لکھا جا چکا تھا۔ اُس وقت کسی تصنیف کے ارادے سے نہیں، بلکہ صرف مطالعے اور استفادے کی غرض سے حکیم صاحب نے وہ پورا انتخاب اپنی بیاض پر نقل کرلیا تھا۔ یعنی پچیس تیس سال کی عمر تک وہ علوم دینیہ اور علمِ طب کے ساتھ اردو کے تمام دبستانوں کی تاریخ، خصوصیات اور تمام ممتاز واہم شعرا کے کلام کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کر چکے تھے۔

علامہ سید سلیمان ندوی

علامہ سید سلیمان ندوی اردو زبان وادب کی وہ جلیل القدر ہستی ہیں، جس نے اپنے علمی اسلوب، تاریخ دانی، سیرت نگاری، تحقیقی مزاج اور تنقید، صحافت اور تعلیم کے اہم موضوعات پر مسلسل لکھ کر اردو کو کئی حیثیتوں سے مالا مال کیا ہے۔ مولانا اپنے ادبی ذوق کی تشکیل ونشو ونما کے متعلق فرماتے ہیں:

''ادبِ عربی کی تعلیم مولانا فاروق اور مولانا سید عبد الحی صاحب مرحوم کے زیرِ سایہ ہوئی۔ مگر یہ دونوں بزرگ متاخرین کے طرز کے زخم خوردہ تھے۔ مولانا شبلی مرحوم کے حسنِ توجہ سے جب دلائل الاعجاز جرجانی درس میں پڑھنے کو ملی تو سب سے پہلے متقدمین کا طرزِ انشا دیکھنے کو ملا۔ شوق سے پڑھی اور اس کی نقالی کی اور کچھ عربی لکھنے اور بولنے کی شد بد پیدا ہوئی۔ حماسہ اور نقد الشعر نے اِس ذوق پر جلا دی اور ان کی پیروی نے نظم کا کچھ انداز پیدا کیا''۔

(مشاہیر اہلِ علم کی محسن کتابیں، ص:۳۳)

آگے چل کر لکھتے ہیں:

''سب سے آخری جلوہ قرآنِ پاک کا نظر آیا۔ مولانا شبلی مرحوم نے اس کا آغاز کیا اور مولانا حمید الدین مرحوم کی دل چسپ ومفید صحبتوں میں یہ چسکا اور آگے بڑھتا گیا اور اِسی کا یہ اثر ہے کہ سیرتِ نبوی کی ہر بحث میں قرآنِ پاک میری عمارت کی بنیاد ہے اور حدیثِ نبوی اس کے نقش ونگار ہیں''۔

(ایضاً،ص:۳۴)

مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی

مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی اپنے عہد کی نہایت محترم و باوقار علمی وملی شخصیت تھے۔ مختلف اہم ملی خدمات کے ساتھ ساتھ تصنیف وتالیف سے وابستہ رہے اور کئی ایسی کتابیں یادگار چھوڑیں، جن کے مقابلے میں اب تک اردو زبان میں دوسری کتاب نہیں لکھی جاسکی۔ اپنے متعلق مولانا نے لکھا ہے:

''سب سے اول جس کتاب کو خود پڑھا، وہ مرزا غالبؔ کی اردوئے معلیٰ تھی۔ والدِ مرحوم نے دیکھنے کو عنایت فرمائی تھی۔ یہ سمجھیے کہ کتاب دیکھنے کے شوق کی یہی بنیاد تھی۔ محض ابتدائی عمر تھی۔ پوری طرح سمجھتا بھی نہ تھا، تاہم دیکھے جاتا تھا۔ اس سے ایک ادبی ذوق کا پیدا ہونا بیّن احساس تھا''۔

(ایضاً،ص:۲۵)

آگے لکھتے ہیں:

''اردوئے معلیٰ کے ذوق کے سلسلے میں

ہوشیار ہونے کے بعد مرزا غالبؔ کی ''انشاء عودِ ہندی'' پڑھی۔ اسی زمانے میں تذکرۂ آبِ حیات، مولوی محمد حسین صاحب آزادؔ دہلوی کا، استاد موصوف کے پاس آیا اور انھوں نے شوق سے اس کو پڑھا۔ اُن کے شوق سے مجھ کو بھی شوق ہوا۔ پڑھا اور خوب پڑھا۔ پہلا ایڈیشن بھی دیکھا اور دوسرا بھی۔ آگے چل کر دربارِ اکبری پڑھی، شوق اور غور سے''۔(ایضاً)

اس کے بعد مولانا علی گڑھ کی آمد و رفت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''بڑی نعمت مولانا شبلیؔ صاحب مرحوم کی صحبت تھی۔ یہ موصوف کے ورودِ علی گڑھ کا ابتدائی زمانہ تھا۔ سب سے پہلے میں نے موصوف کو کشتی کے اکھاڑے میں دیکھا تھا۔ ہر صحبت میں ادبی و تاریخی تذکرے رہتے تھے۔ مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم ، المامون ، الفاروق ، سیرۃ النعمان ، شعر العجم کا مطالعہ کیا، تبصرے لکھے۔ ان کتابوں کے مطالعے میں کلام کی برجستگی ، مؤرخانہ بیان اور وقائع نگاری کی قوت نے خصوصاً دل پر عمیق اثر ڈالا''۔ (ایضاً)

مولانا عبد السلام ندوی

اردو زبان و ادب کی تاریخ میں مولانا عبد السلام ندوی کا نام کئی حیثیتوں سے روشن ہے اور رہے گا۔ تاریخ ان کا خاص میدان ہے۔ ان کی عظمت کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ انھیں طرزِ تحریر میں علامہ شبلیؒ کا کامل مقلد و متبع خیال کیا جاتا ہے۔ مولانا نے نوجوانی کی عمر میں پڑھی گئی کتابوں اور علامہ شبلیؒ کی تصنیفات کو اپنے ذوقِ عالی کی اساس قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''میری محسن کتابیں سکندر نامہ، دیوانِ غنی ، دیوانِ ہلالی اور اخلاق محسنی وغیرہ تھیں۔ فارسی دواوین کے سمجھنے میں مجھے ان سے بڑی مدد ملی اور شاعرانہ تلمیحات ،تشبیہات ، استعارات اور صنائع و بدائع کے سمجھنے اور ان سے لطف اٹھانے میں انھوں نے میرے ساتھ خاموش احسان کیا''۔

(ایضاً،ص:۱۴۶)

پھر آگے چل کر فرماتے ہیں:

''مجھے غلط یا صحیح طور پر طرزِ تحریر میں مولانا شبلیؒ نعمانی کا مقلدِ کامل خیال کیا جاتا ہے۔ غالباً ان کی تصنیفات کے ابتدائی مطالعے کا یہ احسان ہوگا۔ بہر حال میں اُن کی تصنیفات کو اپنا محسن اور اپنا رہبر سمجھتا ہوں''۔

(ایضاً،ص:۱۴۸)

مولانا سید ابو الحسن علی حسنی ندوی

اصحابِ فکر و نظر مولانا سید ابو الحسن علی حسنی ندویؒ کو بجا طور پر Man of The Cuntury کہتے ہیں۔ دوسری بے شمار خدمات کے ساتھ مولانا نے زبان وادب کی بھی مثالی خدمت انجام دی۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن رأفت باشا نے بڑی وزنی گفتگو کر کے مولانا کو ادبِ اسلامی کا نقیبِ اول قرار دیا ہے۔ صرف اردو زبان وادب کے حوالے سے بات کی جائے تو مولانا کی تصنیفات میں کاروانِ مدینہ، نقوشِ اقبالؔ اور پرانے چراغ خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔ مولانا نے مختلف مواقع سے مختلف لوگوں کی فرمائش پر اپنے علمی وادبی ذوق کی تشکیل پر اتنی سیر حاصل گفتگو کی ہے کہ اب وہ ''میری علمی و مطالعتی زندگی'' کے نام سے مستقل کتاب بن گئی ہے۔ اس میں سے صرف اردو زبان وادب کے دائرے میں آنے والی کتابوں کا ذکر کیا جائے تو بھی بات بہت لمبی ہو جائے گی۔ مختصراً اتنا عرض ہے کہ مولانا نے صمصام الاسلام، مسدس حالیؔ، آبِ حیات، نیرنگِ خیال، گل رعنا، یادِ ایام، دلی اور اس کے اطراف کا خصوصیت کے ساتھ تذکرہ کیا اور ان کتابوں کے اثرات بیان کیے ہیں۔ ان کے ساتھ ڈپٹی نذیر احمد، راشد الخیری، مولوی اسماعیل میرٹھی، الطاف حسین حالیؔ کا ذکر اُن مصنفین کے طور پر کیا ہے، جن کی کتابیں مولانا نے نوجوانی کے دنوں میں خوب پڑھیں۔ اُس دور میں مولانا نے جن مصنفوں کو پڑھا، اُن میں سب سے تفصیلی تذکرہ علامہ شبلی نعمانی کا ہے۔ یہ دو اقتباس پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں:

''انھیں دنوں کے کچھ بعد میرے ہاتھ مولانا شبلی مرحوم کی الفاروق آ گئی۔ مطبع نامی، کانپور کی چھپی ہوئی۔ سراپا تصویر۔ پڑھی اور کئی بار پڑھی۔ عراق کی جنگوں، جسر قادسیہ وغیرہ کے میدانِ جنگ کی تصویر، مولانا نے جن چھوٹے چھوٹے بے ساختہ و برجستہ جملوں میں کھینچی ہے، شاید اس سے زیادہ اثر، فردوسیؔ اپنے شاہنامے میں مسلسل اشعار اور پُرشکوہ الفاظ اور مبالغے سے پیدا نہیں کر سکا۔ الفاروق کے جاندار اور گرم جملے اور لفظ، شمشیر و سناں کا کام کرتے ہیں۔ مولانا نے نظامِ خلافت پر جو کاوش کی ہے اس کے سمجھنے کی اس وقت صلاحیت نہ تھی اور اب اس سے کوئی دلچسپی اور علمی تاثر نہیں ہے۔ لیکن واقعات کے حصے کا اثر اُس وقت بھی تھا اور اب بھی ہے''۔

''مولانا کی دوسری کتاب جو اُس دور میں پڑھی، سفرنامۂ روم ومصر وشام تھی۔ اتفاق سے یہی دو کتاب ہمارے گاؤں کے

محدود ذخیرۂ کتب میں تھیں۔ آخر الذکر کتاب سے معلومات میں بڑا اضافہ ہوا۔ ذہن میں وسعت پیدا ہوئی۔ اور کیا عجب ہے کہ اول اول اسی کتاب سے دنیائے اسلام کی سیاحت کا شوق پیدا ہوا ہو، جس کی نوبت برسوں بعد آئی۔ کچھ عرصے بعد مولانا کی سوانحی تصنیفات الغزالی، سوانح مولانا روم اور المامون پڑھیں۔ غالباً اسی وقت سے ذہن نے یہ اثر قبول کیا کہ سوانح حیات اور تذکرہ نگاری کے لیے اس سے بہتر اسلوب اور زبان، جدید اردو میں پائی نہیں جاتی۔ اور غیر ارادی طریقے پر ان تذکروں اور تاریخ دعوت و عزیمت کے سلسلے میں، جو راقم کے قلم سے نکلا، اسی کو اختیار کیا گیا۔ افسوس ہے کہ شعر العجم پڑھنے کی نوبت بہت بعد میں آئی، جس کو میں اپنے موضوع پر منفرد اور مولانا کا شاہ کار سمجھتا ہوں۔ اِس تاخیر میں غالباً میری فارسی کی کم لیاقتی کو دخل تھا''۔ (ایضاً ۱۸۶-۱۸۷)

اِس مختصر جائزے سے یہ بات سامنے آجاتی ہے کہ مشاہیرِ ادب نے اپنے مطالعے میں تنوع بھی رکھا، تعمق بھی رکھا اور تسلسل بھی۔ خوب پڑھا اور سب کچھ پڑھا۔ جو چیز اپنے مزاج کے مطابق پائی اُسے بار بار پڑھا اور جو چیز مزاج پر کھری نہ اتری اُسے ایک مرتبہ پڑھ کر چھوڑ دیا۔ اِس مسلسل و متنوع مطالعے کے نتیجے میں ہی اِن حضرات کے ذوقِ عالی کی تشکیل ہوئی اور اس کے بعد عالی شان ادب وجود میں آیا۔ آج بھی ادبِ اسلامی کے علم برداروں کو یہی راہ اختیار کرنا ہوگی۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو ہمارا ہر نقش پھیکا، ہر تحریر بے اثر اور ہر صدا بے وزن ہو کر رہ جائے گی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

سعدیؔ شیرازی: انسانی اقدار کا شاعر

پروفیسر محمد حسان خان
بھوپال

قوموں کی زندگی میں ادب کی اہمیت ظاہر ہے کہ ادب ہی وہ وسیلہ ہے جو صرف انسان کے ذوق کی حفاظت ہی نہیں کرتا، بلکہ اس کو پروان بھی چڑھاتا ہے، انسان اپنے ذوق و جذبات سے انسان ہے۔ اگر یہ بنیادی صفت نہیں تو انسان بھی نہیں بلکہ وہ معاشرہ ہی نہیں جو خیر و شر کا امتیاز کرنے والا ہے۔ معاشرے اور مثالی معاشرے کے لیے ضرورت ہوتی ہے کہ اسی میں سے کوئی صاحبِ ذوق اور بلند جذبات کا حامل ایسا انسان ہو جو اپنے ہی جیسے انسانوں کے لیے مثالی ہو، جو اپنے جذبات و خیالات سے معاشرے کی تطہیر ہی نہیں، اس کی تعمیر میں کوئی یادگار کردار ادا کر سکے۔

سعدیؔ شیرازی ایسے ہی انسانوں میں ایک ممتاز مقام کے حامل ہیں، ان کی شخصیت اور اس کے مثبت اظہار میں انسانیت اور انسانی اعلیٰ قدروں کی ترویج کا عجیب و دلکش نمونہ ہے۔ شخصیت کو دیکھنے کے لیے اس کا عصری منظر نامہ پیشِ نظر ہو تو شخص اور اس کی زندگی کے باہم رابطوں کی کڑیوں کو آسانی سے گنا جا سکتا ہے اور ان کڑیوں کی قیمت کا اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے۔

سعدیؔ شیرازی کے بارے میں سب جانتے ہیں کہ وہ ایک تہذیبی وحدت کے علم بردار ہیں۔ تہذیبی وحدت سے مراد عربوں اور ایرانیوں کا تہذیبی امتزاج ہے اور یہ ایسے وقت میں سامنے آیا جب حالات کچھ اور ہی تھے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ سعدیؔ کے ماحول کو دیکھا جائے۔ سعدیؔ کا وطن شیراز ہے اور شیراز میں فارس کا حصہ ہے۔ حالیؔ نے اس خطۂ ارض کو مردم خیز کہا ہے اور ثبوت میں یہی کہا ہے کہ اس سے سعدیؔ جیسا مفید مصنف پیدا ہوا۔ سعدیؔ کی افادیت اور مقبولیت پر بعد میں بات ہوگی، پہلے یہ کہنا ضروری ہے کہ شیراز کو دار العلوم کہا گیا۔ وجہ شاید یہی ہو کہ اس شہر کی بنیاد اسلام کے زمانے میں پڑی اور محمد بن قاسم فاتحِ سندھ کے ہاتھوں پڑی۔ آب و ہوا کا اعتدال اس شہر کی خصوصیت رہی اور اس کا اثر وہاں کے باشندوں پر اس طرح ہوا کہ بقول حالیؔ وہاں کے اکثر مشائخ اور علما و شعرا پاکیزہ طبع اور لطیف و ظریف ہوئے۔

سعدیؔ کی پیدائش ۵۸۹ھ/۱۳۳۳ میں ہوئی۔

اس تاریخ میں اختلاف بھی ہے، یعنی ایک تحقیق کے مطابق اتابک مظفر الدین زنگی کے دور میں سعدؔی پیدا ہوئے، جس کے کئی برس بعد اتابک سعد زنگی شیراز کا حکمراں ہوا، سعدؔی نے اسی سعد سے متاثر ہو کر اپنا تخلص سعدؔی رکھا۔ پہلے وہ شرف الدین نام سے پھر مصلح لقب سے آشنا ہوئے ،لیکن دنیا کو انھوں نے خود کو سعدؔی کے نام سے آشنا کرایا۔ سعدؔی نے ہوش کی آنکھیں کھولیں تو ان آنکھوں نے جہاں ایک طرف شیراز کا مدرسہ عضدیہ اور اس کی وجہ سے علمی ماحول کو دیکھا تو دوسری طرف اہلِ سیاست وحکومت کی رنجشوں سے شیراز کو برباد ہوتے بھی دیکھا۔ ساتویں صدی کے آغاز میں یہ شہر ایسا تاخت وتاراج ہوا کہ سعدؔی کو اپنا وطن خیر باد کہنا پڑا اور کہنا پڑا کہ میرا دل شیراز کی صحبت سے تنگ آ گیا ہے، اب وہ وقت ہے کہ مجھ سے بغداد کا حال پوچھو۔ یہ وہ بغداد تھا جہاں عباسی حکومت کا آخری جاہ و جلال بھی سعدؔی کی نگاہوں سے گزرا اور ان ہی آنکھوں نے اس بغداد کو بے چراغ ہوتے بھی دیکھا۔ ہزاروں بنی عباس اور لاکھوں اہلِ بغداد کا تاتاریوں کے ذریعے بے دریغ قتل بھی دیکھا اور عرب کی سطوت وقوت کا ہمیشہ کے لیے صفحۂ روزگار سے مٹنا بھی دیکھا، اور اس سے بھی زیادہ وہ اسباب بھی دیکھے جو عباسیوں اور معتصم باللہ کے زوال کا باعث ہوئے۔

سعدؔی یہ سب دیکھ کر رو پڑے اور کہنے لگے کہ آسمان کا فرض ہے کہ معتصم کی تباہی پر زمین پر خون برسائے۔ بات مرثیے کی ہوتی تو بھی جائز تھی لیکن سعدؔی کو ان حالات نے ایک دوسرا ہی پیغام دیا۔ یہ پیغام قوم کی دل سوزی، بادشاہوں کی اصلاح، رعایا کی ہمدردی اور ہر طبقے کی بھلائی کا خیال تھا۔ اور یہی وہ خیال تھا جو عمر بھر سعدؔی انسانوں کی نصیحت اور خیر خواہی میں ظاہر کرتے رہے اور اسی کوشش کے نتیجے میں گلستاں و بوستاں جیسی کتابیں سامنے آئیں، جنھوں نے انسانیت کی قدروں کو مضبوطی بخشی ، سعدؔی انسانوں کے لیے نجات دہندہ بن گیے، ایسے نجات دہندہ جس کی تلاش سلیم الفطرت انسانوں کو تھی۔ سعدؔی نے ان امراض کے اسباب پر نظر کی جس نے عرب وعراق وعجم کی عظیم الشان مسلم قوم کو بے کار و بے اثر بنا دیا تھا۔

معاملہ بہت پُر لطف ہے کہ اصلاح کی یہ کوشش انھوں نے زمانے میں مروج تعلیمی نظام کے سہارے کو چھوڑ کر زندگی اور اس کے مسائل کو عاشق یا دوسرے لفظوں میں دردمند دل والے شاعر کے ذریعے کی۔ وہ خود کہتے ہیں کہ ’’میرے قبیلے کے تمام لوگ دین کے معلم ہیں لیکن عشق کے معلم نے مجھ سے کہا کہ میں شعر کا پیرایہ اختیار کروں‘‘۔ شعر گوئی کے لیے ذوقِ جمال کا ہونا ضروری ہے اور یہ وہ ذوق ہے جو شعرا کیا، درحقیقت انبیاو مصلحین کو ودیعت ہوا کہ وہ انسان کو ہر قبح اور مکروہ سے دور رکھنا چاہتے تھے۔

سعدیؔ نے کہا کہ اصل عاشق طلبِ جمال وکمال میں لگا رہتا ہے۔ جیسے حضرت یعقوبؑ کی آنکھیں شدتِ غم سے سفید ہوگئی تھیں لیکن یوسف کو دیکھنے کی تمنا ختم نہیں ہوئی۔ طالبِ جمال کو صبر کا پتلا ہونا چاہئے۔ کیمیا گر دھات کو سونے میں بدلنے کے لیے بے چین رہتا ہے، جو محض مال کی چاہت ہے۔ جمال کی جستجو تو اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔ عشق کا مطلب قربانی اور ایثار ہے۔ برداشت اور تکلیف پر برداشت ہے۔ وہ انسان کیا جو اپنی ذات اور انا کے حصار میں ہو۔ انسان تو وہ ہے جو سارے انسانوں کے لیے خیر و کرم کا طالب ہو۔

ایک حکایت میں کہتے ہیں کہ آدمی اپنے ساتھیوں کے ساتھ قید میں ہو، یہ اس سے بہتر ہے کہ وہ غیروں کے باغ میں ہو۔ سعدیؔ نے کہا کہ بنی آدم ایک جسم کی طرح ہیں، ایک ہی عنصر سے ان کی تخلیق ہوئی ہے۔ جسم کے کسی حصے کو بیماری لگ جائے تو سارے اعضا بے چین ہوجاتے ہیں۔ اگر تم کو انسانیت کا درد نہیں تو تم آدمی ہی نہیں۔ وہ اسی انسانیت کو معرفت وطریق کی شاہراہوں پر تلاش کرتے رہے۔ فرماتے ہیں کہ عارف اور صوفی وہ ہے جو لوگوں کی خدمت کرتا ہے۔ وہ نہیں جو عزلت نشیں اور اپنے حجرے میں تنہائی پسندی کا اشتہار کرتا ہے۔ اور عبادت کیا ہے؟ سعدیؔ کہتے ہیں کہ تسبیح شماری اور جانماز کا نام عبادت نہیں۔ ہاں اقتدار کے تخت پر پاک اخلاق سے آراستہ ہوکر ایسے بیٹھو اور پھر درویش بن جاؤ۔ عارف تو وہی ہے جو ایسا علم حاصل کرے جس کے ذریعے وہ انسانیت کی خدمت کرسکے۔ عالم اور عابد میں فرق اگر ہو تو ایسا کہ اگر عالم اپنی جانماز کو غرق ہونے سے بچاتا ہے تو عابد غرق ہونے والے کو بچانے والا ہوتا ہے۔

سعدیؔ کے یہی خیالات تھے جو بوستاں وگلستاں کو عالمی ادب کا ممتاز ترین حصہ بناگیے۔ سعدیؔ بے چین ہوکر مدتِ دراز تک ملکوں ملکوں پھرتے رہے۔ کتاب کا مطالعہ تو وہ مدرسہ نظامیہ میں کرچکے تھے۔ اب کتابِ کائنات کو پڑھنے کی باری تھی۔ عربی فارسی کے ساتھ وہ کئی دوسری زبانیں جان گیے تھے۔ اس باب میں اگر یہ کہا گیا تو بالکل درست ہے کہ مشرقی سیاحوں میں ابن بطوطہ کے سوا سعدیؔ سے بڑھ کر کوئی نہیں۔ اس جہاں گردی کی وجہ کیا تھی؟ اس کا جواب سعدیؔ نے یوں دیا کہ تجھ کو معلوم نہیں کہ میں نے پردیس میں ایک مدت تک کیوں عمر بسر کی۔ میں ترکوں کی چپقلش سے نکل بھاگا تھا، کیوں کہ ملک حبشی کے بالوں کی طرح ژولیدہ ہورہا تھا، سب آدمی کے بچے تھے، لیکن خوں خواری میں بھیڑیوں کی طرح تیز ناخن رکھتے تھے۔ ماحول کے اسی رنگ کو دیکھ کر انسانوں کی ہمدردی کا جوش ہونا ہی تھا۔ سعدیؔ شام میں تھے۔ بادشاہ ظالم تھا۔ لیکن سعدیؔ کی عظمت کا قائل بھی تھا۔ اس نے دعا کے لیے درخواست کی تو سعدیؔ نے کہا: کمزور رعیت پر رحم کرتا کہ

زبردست دشمن سے محفوظ رہے، جس نے بدی کا بیج بویا اور نیکی کی امید رکھی، اس نے ایک لغو خیال پکایا اور بیہودہ امید باندھی ہے۔

سعدؔی کے ذکر میں گلستاں و بوستاں کا ذکر آنا تو لازمی ہے کہ ان کے سینکڑوں فقرے اور شعر اور مصرعے ضرب المثل بن گیے لیکن سعدؔی کی اور بھی کتابیں ہیں، پندنامہ، قصائد فارسی، قصائد عربی، طیبات، بدائع، خواتیم، غزلیات اور صاحبیہ جیسے دواوین لیکن گلستاں کی شہرت کے سامنے سب پھیکے پڑگیے، حالاں کہ گلستاں میں مقبولیت کا کوئی عنصر جیسے رزم، افسانے، فوق العادہ قصے، حقائق و معارف، اسرارِ شریعت، نکاتِ طریقت، غزل عاشقانہ، قول عارفانہ کچھ بھی نہیں، مگر ایک بات جو گلستاں کو گلستاں بناگئی وہ وہی ہے جس کی جانب حالؔی نے اشارہ کیا کہ اس کی بنیاد محض اخلاق، پندوموعظت پر رکھی گئی، جو اگرچہ پھیکی ہے لیکن سعدؔی کی فصاحت و بلاغت، حسنِ بیان اور طرزِ ادا نے اس کو بے مثل بنادیا۔ یہ جگ بیتی ہے جہاں سیدھی سادی باتیں ہیں مگر یہی انسانیت کی معرفت اور قدر کا نشان بن جاتی ہے، جیسے حکایت کہ ایک بدمعاش سائل نے اپنے کو قرض دار ظاہر کرکے ایک بزرگ سے دو دینار حاصل کیے۔ لوگوں نے کہا کہ یہ تو مکار ہے، اس کو کچھ نہ دینا چاہئے تھا۔ فرمایا اگر مکار تھا تو میں اس کے شر سے بچا، ورنہ اسے اوروں کے شر سے بچایا۔ اور یہ کہ ایک شاہ زادے کے تاج کا لعل اندھیری رات میں ایک پتھریلی جگہ گر گیا تو بادشاہ نے بیٹے سے کہا کہ پتھروں سے لعل پانا چاہتا ہے تو پتھر ہی کو لعل سمجھ کر غور سے دیکھ۔ سعدؔی کی نثر ہو یا نظم، فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ کون برتر ہے لیکن بقول علامہ شبلی:

> شریعتِ شعر کے تین پیغمبر ہیں۔ ان میں ایک سعدؔی بھی ہیں۔ ایک مشہور قطعہ سے بھی یہی ثابت ہے کہ: ہرچند کہ لا نبی بعدی۔ شعر میں تین پیغمبر ہیں: ادبیات میں فردوسؔی، قصیدہ میں انورؔی اور غزل میں سعدؔی۔ ہم اس بحث میں نہیں جاسکتے لیکن سعدؔی شناسوں کی اس بات سے اتفاق ضرور کرسکتے ہیں کہ سعدؔی پہلے شخص ہیں جنھوں نے فارسی شاعری کا صحیح استعمال کیا۔ یہ صحیح استعمال کیا ہے؟ آزادیِ اظہار۔ کہتے ہیں کہ شاعری کی اصل روح یہی تھی جو عجم میں آکر گم ہوگئی تھی، یا پھر مدحیہ قصائد کی اصلاح۔ سعدؔی نے شاعری کے چہرے سے یہ داغ مٹادیا اور یہ کہہ کر مٹادیا کہ آزاد گردن کسی کے آگے جھک نہیں سکتی لیکن سب سے بڑا وصف سعدؔی کی وہ اخلاقی شاعری ہے جو آج کا موضوع ہے۔

کہتے ہیں کہ اخلاقی شاعری کو سنائؔی، خیاؔم، اوحدؔی اور عطاؔر نے آسمان تک پہنچادیا تھا، تاہم سعدؔی نے

اس آسمان کو اور بلند کر دیا۔ انسانیت کی فلاح کے لیے اخلاق لازمی ہے۔سعدیؔ نے جو اخلاقی عناوین قائم کیے وہ اسی بات کا ثبوت ہیں، جیسے عدل و تدبیر، احسانِ عام، محبت، تواضع، رضا بالقضا، قناعت، تربیت، شکریہ، توبہ و مناجات۔سعدیؔ نے اپنی اس شاعری سے پیغام دیا کہ ملک کی آمدنی میں بادشاہ کا صرف اسی قدر حق ہے کہ بقدرِ ضرورت اس کو استعمال کرے۔اس سے زیادہ کا اس کو کوئی حق نہیں۔

ایک شعر میں یہ حکایت درج کی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک غیر کو مومن سمجھ کر مہمان کیا۔ جب اس کا غیر مومن ہونا ظاہر ہوا تو دستر خوان سے اٹھا دیا۔ اس پر وحی آئی کہ میں نے اس کو سو برس تک کھلایا۔تم دم بھر بھی اس کے ساتھ بسر نہ کر سکے۔ انسانی معاشرے کی کامیابی کے لیے قناعت کا درجہ سعدیؔ کے ہاں کیا ہے؟ وہ کہتے ہیں: اگر تم قناعت اختیار کرو گے تو تم کو بادشاہ اور فقیر یکساں نظر آئیں گے۔تم بادشاہ کے سامنے کیوں سر جھکاتے ہو؟ طمع چھوڑ دو، تم خود بادشاہ ہو۔جو شخص طمع چھوڑ دے گا وہ اپنے آپ کو غلام اور خانہ زاد نہیں لکھ سکتا۔نفسِ امارہ انسان کو ذلیل کرتا ہے۔اگر تم کو عقل ہے تو تم نفس کی عزت کرو۔تم کو زمین پر پڑ کر سو رہنا چاہئے لیکن قالین کے لیے کسی کے آگے زمین نہیں چومنی چاہئے۔

سعدیؔ نے ایک اور بات بڑے پتے کی کہی کہ بچے کو سر و سامان سے رکھنا چاہئے تا کہ اس میں بلند نظر پیدا ہو اور لوگوں کی طرف اس کی نگاہیں حسرت سے نہ اٹھیں۔ یہ سعدیؔ ہیں جو کہتے ہیں کہ خاموشی عالم و جاہل دونوں کے لیے مفید ہے۔عالم کا تو وقار بڑھتا ہے اور جاہل کا پردہ ڈھکا رہتا ہے۔ کہتے ہیں اس شخص نے عبادت کا پھل نہیں چکھا جو خدا سے بھلائی سے پیش آئے اور مخلوقات سے برائی سے۔اور کیا بات کہی کہ کج خلق عابدوں کی عبادت اصلی نیکی اور دل کے اقتضا سے نہیں ہوتی بلکہ سزا اور عتاب کے ڈر سے ہوتی ہے۔اس کا ثبوت یہ ہے کہ جس سے ان کو اس قسم کا اندیشہ نہیں ہوتا، اس سے وہ کج خلقی، بدمزاجی اور دل آزاری کا برتاؤ کرتے ہیں۔ایک جگہ کہتے ہیں کہ بادل سے ایک قطرہ ٹپکا، دریا کا پاٹ دیکھ کر شرمایا کہ اس کے آگے میری کیا حقیقت ہے۔چوں کہ اس نے اپنے آپ کو حقیر سمجھا، سیپ نے اس کو اپنی گود میں لیا، چند روز کے بعد دیکھا تو وہی قطرہ گوہرِ شاہوار تھا۔

یہ چند مثالیں ہیں، ورنہ سعدیؔ کی داستان بہت طویل ہے، جس کو دیکھ کر یہی کہہ سکتے ہیں کہ سعدیؔ انسانیت کے شاعر تھے اور یہی ان کی سب سے بڑی پہچان ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

☆☆☆☆☆

☆☆☆

انسانیت کی خدمت میں

مختلف اصنافِ ادب کا حصہ

مولانا محمد شعیب کوٹی، ممبئی

ادب نے انسانی زندگی میں ایک اہم رول ادا کیا ہے، جس کے مثبت اور منفی دونوں پہلو ہیں۔ ہم لوگ اکثر اس غلطی کا شکار ہوئے ہیں کہ کسی چیز کے صرف منفی پہلو کو سامنے رکھ کر ہم نے اس کے جواز یا عدمِ جواز کا فیصلہ کیا اور نتیجے کے طور پر کئی صدیاں برباد کیں۔ ہر زبان کے ادب میں یقیناً کچھ منفی پہلو بھی ہوتے ہیں لیکن اس میں شبہ نہیں کہ ادب قوم وملک کی تعمیر میں بہت بڑا رول ادا کرتا ہے۔

زبان و ادب کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ قدیم تہذیبوں میں چار ہزار سال قبلِ مسیح میں مصر اور سُمیرا دو تہذیبوں کی زبانوں میں ادب کا پتہ چلتا ہے۔ بنیادی طور پر کسی زبان میں لکھی ہوئی چیزوں کو ادب کا نام دیا جاتا ہے۔ لیکن اکثر اس میں زبانی کہی گئی باتوں یا گیتوں کو بھی شامل کرلیا جاتا ہے۔ ادب عام تحریروں سے مختلف ہوتا ہے ، جیسے سرکاری خطوط بھی لکھے ہوتے ہیں لیکن وہ ادب کا حصہ نہیں بنتے۔ ایک زبان افعال اور اسما سے بن جاتی ہے لیکن یہ زبان بالکل روکھی پھیکی اور بے رس ہوتی ہے، اسی لیے علوم سکھانے والی کتابیں بھی عموماً بہت خشک ہوتی ہیں۔ محاورے، روزمرہ، تشبیہ، استعارے اس میں رنگ بھرتے ہیں اور زبان کو خوبصورت بناتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ جب ہم تاریخ اور جغرافیہ کو کتابوں میں پڑھتے ہیں تو ان میں ہمیں کوئی مزہ نہیں آتا لیکن اگر یہی تاریخ اور جغرافیہ جب ہم کسی ادیب کے سفرنامے میں پڑھتے ہیں تو وہ انتہائی دل چسپ لگنے لگتا ہے، یہی نہیں ادیب کا اندازِ بیان اسے مزید خوبصورتی عطا کرتا ہے اور وہ ادب کا حصہ بن جاتا ہے۔ گویا ادب ایسی تخلیقی تحریریں ہیں جس میں ادب اپنے تخیل کا سہارا لے کر کسی خیال کو اس انداز میں پیش کرتا ہے کہ وہ قاری کے دل اور دماغ پر اثر انداز ہو سکے۔

ادب کی بہت سی اصناف ہیں لیکن بنیادی طور پر وہ نثر یا نظم میں ہوتا ہے لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا کہ ادیب کا اصل مقصد قاری کے دل و دماغ پر اثر انداز ہونا ہوتا ہے، اس لیے تجربات کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ نظم نثر کے مقابلے میں زیادہ تاثیر رکھتی ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ نظم میں مبالغے کی اجازت ہوتی ہے اور اس کی اپنی روایات ہوتی ہیں، جن سے قاری خوب واقف ہوتا ہے، اس لیے کم

لفظوں میں بڑی بات کہی جاسکتی ہے۔ یوں ادب میں تمام ادبی تحریریں شامل کی جاسکتی ہیں لیکن بنیادی طور پر ناول اور افسانہ اور شاعری سے ادب متعین ہوتا ہے۔ چونکہ ناول اور افسانہ جھوٹ پر مبنی داستانیں ہوتی ہیں اس لیے بیسویں صدی کے اوائل میں انھیں مخرب اخلاق سمجھ کران سے پہلوتہی کی گئی اور اکثر گھروں میں ان کے پڑھنے پر پابندی رہی۔

غدر ۱۸۵۷ کے بعد اور بیسویں صدی کے اوائل میں جب مسلمان اپنی حکومت کھو چکے تھے، اخلاقی زوال اپنی انتہا پر تھا، دین کا صرف نام باقی رہ گیا تھا، افلاس کی گھر گھر پکار تھی، تعصّبات کی گھٹا چھائی ہوئی تھی، رسم ورواج کی بیڑیاں پیروں میں پڑی ہوئی تھیں، اور ان کے سبب چلنا ممکن نہیں تھا، نیز جہالت اور تقلید سب کی گردن پر سوار تھی، لوگ غافل اور بے پروا تھے اور زمانے کی ضرورتوں اور مصلحتوں سے یکسر ناواقف تھے۔ ۱۸۶۶ میں دار العلوم دیوبند کی تاسیس ہو چکی تھی اور دو دہائیوں کے بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء قائم ہوگیا۔ دوسری طرف علی گڑھ تحریک نے جڑ پکڑ لی اور دنیوی تعلیم کا شعور قوم میں بیدار ہونے لگا، گو یہ بہت ہی کم تھا لیکن ان سب واقعات اور تحریکات کے اثرات ادب پر پڑنے یقینی تھے۔ اس زمانے میں اخلاقی بنیادوں پر اصلاحی ناول والدہ افضال علی نے لکھے، ڈپٹی نذیر احمد کے ناول مرآۃ العروس اور توبۃ النصوح نے بھی غیر معمولی شہرت حاصل کی۔ راشد الخیری کی صبحِ زندگی، شامِ زندگی اور شبِ زندگی تو ایسے ناول ہیں جنھوں نے کئی نسلوں کو متاثر کیا۔ ان کے علاوہ ظفیر الحسن اور بعد کے دور میں اے آر خاتون، ہاجرہ نازلی، صالحہ عابد حسین، نسیم انہونوی، عفت موہانی، مسرور جہاں جیسی بے شمار ادبا نے معاشرتی اور اخلاقی ناول اور افسانے لکھ کر نئی نسلوں کی ذہنی تربیت کی۔

پھر یہ کام نثری ادب تک ہی محدود نہیں رہا، بلکہ اردو کے شعرا نے بھی نظم کے ذریعے انسانیت کی بڑی خدمت کی۔ چونکہ نظم زیادہ مؤثر ہوتی ہے، اس لیے اکثر مفکرین جو عوامی سطح پر بات کہنا چاہتے ہیں، انھوں نے نظم کو اختیار کیا۔ جس کی ایک مثال علامہ اقبالؔ ہیں۔ اقبالؔ بنیادی طور پر شاعر ہی نہیں بلکہ مفکر بھی ہیں۔ انھوں نے اپنی فکر کو عوام کے سامنے پیش کرنے کے لیے نظم کا پیرایہ اختیار کیا اور انتہائی مؤثر انداز میں اپنی بات پیش کی۔ یہ الگ بات ہے کہ ان میں اتنی زبردست خداداد صلاحیت تھی کی شاعری کے میدان میں بھی انھوں نے بہت سے قدآور شاعروں کو پیچھے چھوڑ دیا۔ خود بقول ان کے ؎

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے

اور اسی لیے ان کی طویل نظم شکوہ اور جوابِ شکوہ نے پورے ملک میں ایک تہلکہ مچا دیا۔ علامہ جب مشاعروں میں اپنی

یہ نظم سناتے تھے تو لوگ زار وقطار روتے تھے۔

علامہ کا پورا کلام اخلاقی ہے اور تاریخی حوالوں سے مزین ہے۔ اس میں تلمیحات کی کثرت کے سبب تاریخِ اسلام کو پڑھے بغیر کوئی قاری یا سامع ان کے کلام سے پوری طرح لطف اندوز نہیں ہوسکتا۔ان حالات میں مسلمانوں کے اخلاقی زوال پر تادیبی انداز میں جس شاعر نے سب سے مؤثر کلام پیش کیا، وہ مولانا الطاف حسین حالؔی تھے۔ حالؔی نہایت حساس اور دردمند دل رکھتے تھے۔ قوم کی پستی اور زوال اور جمود وغفلت پر ان کا دل کڑھتا تھا ۔انھوں نے بیداریٔ قوم اور اصلاح کے مقاصد کے لیے اپنی شاعری کو مؤثر انداز میں استعمال کیا۔ وہ سرسید کے حامیوں بلکہ ساتھیوں میں شامل تھے اور اس علمی تحریک کے علم برداروں میں سے تھے جنھوں نے جہالت کے گھٹاٹوپ اندھیرے میں علم کا ایک چھوٹا سا چراغ جلانے کی ہمت کی تھی۔ حالؔی کی مشہور طویل نظم ''مد و جزرِ اسلام'' المعروف بہ مسدس حالؔی حالانکہ مسلمانوں کی حالتِ زار کا مرثیہ ہے اور انھیں اس کی پذیرائی کی مطلق امید نہیں تھی لیکن اس کی غیر معمولی قبولیت اور شہرت پر خود حالؔی نے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اگر قوم کے دل میں متاثر ہونے کا مادہ نہ ہوتا تو یہ اور ایسی ہزار نظمیں بیکار تھیں۔ پس مصنف کو اگر فخر ہے تو صرف اس بات پر کہ اس نے زمینِ شور میں تخم ریزی نہیں کی اور پتھر میں جونک لگانی نہیں چاہی۔اس نظم کے علاوہ ''مناجاتِ بیوہ'' اور ''چپ کی داد'' حالؔی کی شاہکار نظموں میں سے ہیں۔ حالات کی تبدیلی کا لامحالہ اثر ادب پر پڑتا ہے، اسی لیے بیسویں صدی میں بچوں کی تربیت کے لیے مولانا اسماعیل میرٹھی، شفیع الدین نیّر اور حامد اللہ افسؔر جیسے شعرا نے اپنی نظموں کے ذریعے اسکول کے ابتدائی درجوں میں بچوں کی کشتِ ذہن کی آبیاری کی۔

سچ پوچھیے تو اخلاقی تعلیمات کے لیے سیرتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں۔ یوں سیرت کا تعلق تاریخ سے ہے، ادب سے نہیں، کیوں کہ ادب میں حسن ہی اس وقت پیدا ہوتا ہے جب اس میں ممدوح کی جا و بیجا مدح سرائی کی جائے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ شعرا نے محبوب کی شان میں اور اپنی محبت کے اظہار میں جو کچھ بھی کہا ہے، اس میں اس وقت تک حسن ہی نہیں پیدا ہوتا جب تک کہ اس میں مبالغہ یا جھوٹ کی آمیزش نہ ہو اور محبوب کے اوصاف میں وہ چیزیں بھی شامل نہ کردی جائیں جو اس میں نہیں ہیں۔ کسی شعر میں جب تک شاعر اپنی تعریف میں تعلّیٰ کا اظہار نہ کرے یا محبوب کی شان میں ایسی باتیں نہ کہے جو جھوٹ پر مبنی ہیں، اس وقت تک شعر مزہ نہیں دیتا۔ یہاں تک کہ محبوب کو خدا اور مسجود تک بنا دیا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے سیرت نگاری اور ادب میں بُعد المشرقین ہے۔ اسی لیے سیرت نگاری میں اس کا التزام

رکھنا کہ تحریر میں حقیقت کو اس طرح پیش کیا جائے کہ اس کی ادبی حیثیت بھی مجروح نہ ہو، ایک بڑا مشکل کام ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ سیرت نگار اپنی تحریر میں ادبی پہلو سے پہلو تہی کرنے ہی میں عافیت محسوس کرتے ہیں کہ مبادا جوشِ محبت میں کوئی بات خلافِ واقعہ نہ آجائے یا کسی جگہ تحریر پر کذب کا داغ نہ لگ جائے۔ لیکن بعض مصنفین نے ادبی اسلوب پر سیرت نگاری کی جس سے متعدد شہہ پارے وجود میں آئے۔ اس لیے بجا طور پر ہم اسے بھی ادب کا حصہ مان سکتے ہیں۔ کیوں کہ انھوں نے سیرت کو ایک نئے زاویے سے دیکھ کر اسے حسن کا ایک اضافی پہلو دے دیا۔

ایک مسلمان جب سیرت نگاری کرتا ہے تو اس میں جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس عشق اور محبت کا پرتو نظر آنا لازمی ہے جو ہر مسلمان کے ایمان کا حصہ ہے۔ اسی لیے سیرت نگاری اپنے میں بہت سے پہلو لیے ہوئے ہے اور ہر پہلو دوسرے سے جداگانہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سیرت کی ہر کتاب کو پڑھنے میں قاری کو وہی لطف اور حظ حاصل ہوتا ہے جو کسی نئی کتاب کے پڑھنے میں ہوسکتا ہے۔ اور یہی چیز ہے جسے ہم سیرت کا ادبی پہلو کہہ سکتے ہیں۔ مختلف سیرت نگاروں میں اس محبت کے اظہار کے انداز ہمیں مختلف ملیں گے۔ جیسے کچھ شعرا نے منظوم سیرت لکھ کر اپنی محبت کا اظہار کیا۔ فوقؔ جامی کی ''رحمتِ عالم'' اور قیصر الجعفری مرحوم کی ''چراغِ حرم'' تو ہمارے زمانے کی چیزیں ہیں جن میں پوری سیرت کو نظم کیا گیا ہے لیکن منظوم سیرت میں ابو الاثر حفیظؔ جالندھری کے ''شاہنامۂ اسلام'' نے بے پناہ مقبولیت حاصل کی اور اس کے ذریعے سے انھوں نے بے شمار گھروں میں عام مسلمان، خصوصاً عورتوں اور بچوں کو سیرت سے روشناس کروایا۔ شاہنامے کی سب سے بڑی خوبی اس کا اندازِ بیان ہے جس میں انتہائی سادہ اور آسان زبان میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ سیرت کے واقعات کو قلم بند کیا گیا ہے۔

بعض سیرت نگاروں نے سیرت کو کسی مخصوص زاویے سے دیکھا اور اس میں ایک حسن کا پہلو تلاش کیا۔ جس کی مثال شام کے مشہور عالمِ دین ڈاکٹر محمد سعید رمضان البوطی کی لکھی سیرت ''فقہ السیر'' ہے جس کا اردو ترجمہ اب ''سیرتِ رسول - دروس اور نصائح'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اس کی خوبی یہ ہے کہ اس میں سیرت کے واقعات کو مختصراً بیان کر کے اس سے دروس و احکام کا استنباط کیا ہے۔ گویا اس میں صرف تاریخ نویسی نہیں ہے بلکہ اس تاریخ کو پڑھنے کا مقصد بھی سامنے رکھا ہے جس سے اس کتاب کی ایک ادبی حیثیت بھی متعین ہوتی ہے۔

اس سلسلے میں عثمانیہ یونیورسٹی کے فاضل شاہ مصباح الدین شکیل صاحب کی ''سیرتِ احمدِ مجتبیٰ'' ایک اہم نام ہے جس کی ایک خصوصیت اس کے عناوین ہیں جو خالص ادبی رنگ لیے ہوئے ہیں۔ مثلاً رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کو بچپن میں حضرت حلیمہ لے جاتی ہیں تو اس واقعے کا عنوان ''حمدِ باری کو اُٹھے دستِ دعا آخرِ شب'' ہے۔ یا اپنی رضاعی بہن کے کندھے پر بچپن میں آپ نے کاٹا تھا جس کا نشان نصف صدی بعد جب انھوں نے مدینے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دکھایا تو آپ نے ان کی بڑی تکریم فرمائی، اس واقعے پر عنوان ''روش روش پہ تھے روشن چراغ یادوں کے'' دیا ہے۔ اسی طرح بہت سے عناوین مصرعوں کی شکل میں یا کسی خوبصورت ترکیب کی شکل میں ہیں ، جیسے : ماورائے سخن بھی ہے اک بات۔ ازل کے مصنف کے اوراقِ فطرت۔ نہالِ تمنا۔ انا کا خول۔ نمودِ نبوت اور داغِ شکست وغیرہ۔ یہ کتاب تین جلدوں میں ہے۔ اس میں تفصیلات ادبی رنگ میں بھی پیش کی گئی ہیں جو طوالت چاہتی ہیں، جیسے ابو جہل نے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پتھر مار کر زخمی کیا تھا تو حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے حالتِ کفر میں خاندانی محبت اور غیرت کے سبب ابو جہل کو اپنی کمان سے مارا اور زخمی کر دیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جا کر کہا کہ: برادر زادے! خوش ہو جاؤ کہ میں نے ابو جہل سے تمھارا بدلہ لے لیا تو آپ نے فرمایا کہ: چچا! میں تو اس وقت خوش ہوتا جب آپ دینِ اسلام کے ستون بن جاتے۔ اس پر حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کر لیا تھا جس پر مصنف لکھتے ہیں کہ:

''حمایت ہاشمیت تائیدِ حق میں بدل گئی''۔ اسی طرح ماؔہر القادری نے سیرت کی کتاب ایک ناول کے انداز میں لکھی جس کا عنوان ''دُرِّ یتیم'' ہے،جس میں قاری کی دل چسپی کے لیے سیرت لکھتے ہوئے انھوں نے کہانی کا پیرایہ اختیار کیا۔

اس میں شبہہ نہیں کہ ادب کے ذریعے انسانیت کی عظیم خدمت ہوئی بلکہ جب کبھی قوم گمراہی کے راستے پر گامزن ہوئی اسے راہِ راست پر لانے کے لیے ادب نے اپنا رول بہت مؤثر انداز میں ادا کیا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ادب کی تاریخ میں

اردو کے ممتاز ادیب اور نثر نگار

پروفیسر محسن عثمانی ندوی

ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کے خاتمے کے بعد ملک پر انگریزوں کا تسلط ہوگیا اور پھر بتدریج وہ وقت آگیا کہ انگریزی زبان ملک میں رائج ہوگئی اور لوگوں نے انگریزی ادبیات کا مطالعہ کرنا شروع کیا اور اردو نثر میں نئے طریقۂ اظہار کو اختیار کیا گیا اور کئی بڑے نثر نگار اور نقاد پیدا ہوئے جنہوں نے انگریزی نثر کی پیروی کی، زبان میں سادگی پیدا ہوئی اور پر تکلف اظہار کے طریقوں کو اور مسجع عبارتوں کو ترک کیا گیا۔ پہلے سرسید نے اردو شعرونثر کو نیا راستہ دکھایا، انہوں نے ادب کی افادیت اور مقصدیت پر زور دیا، مبالغہ آرائی اور لفاظی اور تصنع اور قافیہ پیمائی سے روکا، وہ خود اچھے نثر نگار تھے، انہوں سادہ اور سلیس نثر کا نمونہ پیش کیا، انہوں نے تہذیب الاخلاق کے نام سے اصلاحی رسالہ جاری کیا، یہ مجلّہ اصلاحی اور سادہ اور سلیس عبارت کا نمونہ تھا، اس نمونے کو بہت سے اہلِ قلم نے اختیار کیا، محسن الملک، چراغ علی، الطاف حسین حالی اور شبلی، نذیر احمد اور بہت سے اہلِ قلم پیدا ہوئے، انگریزی ادبیات سے استفادہ کے بعد ناول بھی لکھے جانے لگے، افسانہ نگاری کو بھی ترقی ملی، جس کی ابتداء نذیر احمد اور راشد الخیری سے ہوئی، عبد الحلیم شررؔ اور مرزا محمد ہادی رسواؔ کے ناول مقبول ہوئے، ڈرامہ نگاری کا فن بھی مقبولِ عام ہوا، انگریزی ادب کے مطالعے کے بعد بہت سے نقاد میدان میں آئے جنہوں نے بہت سے نئے تنقیدی نظریات پیش کیے، ہر میدان میں اردو زبان میں لکھنے والے بہترین اہلِ قلم پیدا ہوئے۔

مرزا غالبؔ (۱۷۹۶ـ۱۸۶۹)

مرزا غالبؔ جتنے بڑے شاعر تھے اتنے ہی بڑے نثر نگار بھی تھے، انہوں نے اردو میں چند کتابوں پر تقریظیں لکھی ہیں اور ان کے علاوہ چند چھوٹی کتابیں بھی لکھی ہیں، ان کتابوں کی تحریر فسانہ عجائب کی زبان کی طرح مصنوعی قسم کی ہے، البتہ انہوں نے اردو میں جو خطوط لکھے ہیں ان

سے اردو نثر کی ترقی میں بہت مدد ملی ، غالبؔ کے زمانے میں فارسی میں خط لکھنے کا رواج تھا، خود غالبؔ فارسی میں خط لکھا کرتے تھے لیکن بعد میں انہوں نے اردو میں خط وکتابت شروع کی اور جو لکھا قلم برداشتہ لکھا، ان کا یہ بے تکلف انداز بہت پسند کیا گیا اور خط وکتابت کا انہیں بہت شوق تھا، خود ان کا بیان ہے کہ دن کا زیادہ حصہ خط پڑھنے اور خط کا جواب دینے میں گزر جاتا تھا، خط کو آدھی ملاقات کہا جاتا ہے، غالبؔ نے ایسا طرز واسلوب ایجاد کیا کہ خط پوری ملاقات بن گیا ، اور ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ غالبؔ خط نہیں لکھ رہے ہیں بلکہ سامنے بیٹھے باتیں کر رہے ہیں، ایک جگہ بڑے فخر سے کہتے ہیں'' میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے، سو کوس سے بزبانِ قلم باتیں کیا کرو، ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو''

مرزا غالبؔ کا مزاج نرالا تھا، کسی کی پیروی کو باعثِ شرم خیال کرتے تھے، ہر معاملے میں اپنا راستہ آپ نکالتے تھے، ان کے عہد میں مراسلہ نگاری کا جو انداز تھا اسے رد کر کے انہوں نے نیا انداز اختیار کیا ، انہوں نے مختصر سے مختصر القاب لکھے ، جیسے بھائی صاحب، مہاراج ، میری جان ، بندہ پرور اور کسی خط میں بس مکتوب الیہ کا نام لیا اور اپنی بات شروع کر دی، یہ مثالیں ملاحظہ کیجیے:

''یوسف مرزا، تجھ کو کیوں کر لکھوں کہ تیرا باپ مر گیا''

''میاں لڑکے، کہاں پھر رہے ہو، آؤ بیٹھو''

''ارے کوئی ہے؟ ذرا یوسف مرزا کو بلائیو، لو صاحب وہ آئے''

''کبھی مرزا غالبؔ خط لکھنے میں سرے سے القاب نہیں لکھتے خط شروع کر دیتے ہیں بلکہ ایک دو جگہ تو یہ بھی کیا کہ آخر میں اپنا نام بھی نہیں لکھا، صرف یہ لکھ دیا کہ'' ہم اپنا نام نہیں لکھتے، دیکھیں تم پہچان جاتے ہو کہ نہیں''۔

خطوطِ غالبؔ کی ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ انہوں نے اپنے خاندان کے، اپنے اباء واجداد کے اور خود اپنے مکمل حالات بیان کر دئے ہیں، حد یہ ہے کہ غالبؔ نے ان باتوں کو بھی نہیں چھپایا جنہیں اکثر لوگ چھپا جاتے ہیں مثلا ان خطوں میں غالبؔ کی شراب نوشی کا ذکر موجود ہے ، ایک ڈومنی انھیں چاہتی تھی، یہ بات بھی صاف صاف بتا دی، اپنی تنگ دستی اور مہاجن سے قرض لینے کا حال بے کم وکاست لکھ دیا، یہ خطوط غالبؔ کی مکمل سوانح عمری ہیں۔

غالبؔ کے زمانے کی دلی کو دیکھنا ہو تو غالبؔ کے خطوط کی ورق گردانی کیجیے، غدر کے حالات، دلی کا اجڑنا، بے گناہوں کا مرنا یا سزا پانا سب کچھ ان خطوط میں موجود ہے۔ غالبؔ نہایت شگفتہ مزاج تھے ، شوخی اور ظرافت طبیعت میں داخل تھی، جبھی تو حالؔی نے انھیں ''حیوانِ ظریف'' کہا ہے۔ یہ خطوط لطیفوں ، چٹکلوں اور دل چسپ

باتوں سے بھرے پڑے ہیں۔ یہ سمجھنا غلط ہے کہ غالبؔ نے ان خطوں میں صرف بول چال کی زبان استعمال کی ہے، جہاں علمی معاملات کا ذکر ہو وہاں انہوں نے علمی زبان کا استعمال کیا ہے۔

سر سید احمد خان (۱۸۱۷۔۱۸۹۸)

سر سید احمد خان انیسویں صدی کے ایک بہت بڑے رہنما ہوئے ہیں، ہندوستانیوں اور خاص طور پر ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی میں ان کی تعلیمی اور فکری رہنمائی سے ایک خوش گوار تبدیلی رونما ہوئی، وہ قوم جو سستی، کاہلی اور بے عملی کی بیماری میں مبتلا ہو کر تباہی کے گڑھے میں گر گئی تھی، سر سید کے جگانے سے جاگی، ہوش میں آئی، جہد و عمل پر کمر بستہ ہوئی اور ترقی کے راستے پر گامزن ہوئی۔

انھوں نے مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبے پر توجہ کی اور جہاں جہاں خرابی نظر آئی اسے دور کرنے کی کوشش کی، انھوں نے مسلمانوں کو انگریز دشمنی سے بچنے اور کچھ دنوں کے لیے سیاست سے دور رہنے کا مشورہ دیا اور مسلمانوں کو مذہب کی اصل روح سے روشناس کرنے کی کوشش کی۔

سر سید نے اردو شعر و ادب کو بھی ایک نیا راستہ دکھایا، انھوں نے واضح کر دیا کہ شعر و ادب نہ تو بے کاروں کا مشغلہ ہے، نہ تو تفریح اور دل لگی کا ذریعہ ہے، بلکہ یہ زندگی کو سنوارنے اور بہتر بنانے کا آلہ ہے۔ مراد یہ ہے کہ انھوں نے ادب کی افادیت اور مقصدیت پر زور دیا، اردو نثر میں جتنے عیب تھے انھوں نے گن گن کر بتائے۔ مبالغہ آرائی، لفاظی، تصنع اور قافیہ پیمائی اردو نثر کے وہ عیب تھے جن سے سر سید کو نفرت تھی۔ ان کی خواہش تھی کہ اردو نثر میں وہ صلاحیت پیدا ہو جائے کہ کام کی بات سیدھے سادھے لفظوں میں ادا کی جا سکے، تاکہ بات مصنف کے دل سے نکلے اور قاری کے دل میں بیٹھ جائے، وہ خود نثر نگار تھے، انھوں نے ایسا کر کے دکھا دیا، ان کی رہنمائی اور تربیت سے بہت سے ایسے ادیب پیدا ہوئے جو سر سید کی طرح وضاحت کے ساتھ مؤثر انداز میں اظہارِ خیال پر قدرت رکھتے تھے۔

ایک انگریز ولیم میور نے ''لائف آف محمد'' کے نام سے سیرت پر ایک کتاب لکھی اور حضور (ﷺ) کی شان میں گستاخی کی۔ سر سید نے کتاب دیکھی تو مضطرب ہو گیے، تمام اثاثہ فروخت کر کے اور دوستوں سے قرض لے کر انگلستان گئے اور اس کا دنداں شکن جواب لکھا جو بعد کو اردو میں خطباتِ احمدیہ کے نام سے شائع ہوا، یہ کتاب سر سید کے استدلالی اندازِ بیان کا بہترین نمونہ ہے، انگلستان ہی میں انہوں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ ہندوستان واپس آ کر تہذیب الاخلاق کے نام سے ایک رسالہ جاری کریں گے، یہ اصلاحی رسالہ جاری ہوا اور اس نے

مسلمانوں میں زندگی کی لہر دوڑادی ، اردو نثر کو اس سے خاص طور پر فائدہ پہونچا، اس رسالے نے مسلمانوں میں بیداری پیدا کی اور اردو نثر کو نئی جہت عطا کی ۔اردو نثر پر سرسید کا احسان ہے کہ اس نے نئی زندگی پائی اور نئے اسلوب سے آشنا ہوئی۔

محسن الملک (۱۸۱۷۔۱۹۰۷)

سید مہدی علی نام تھا،محسن الملک کا خطاب پایا تو لوگ نام بھول گئے اور محسن الملک ہی کہنے لگے ، ان کی پیدائش اٹاوہ میں ہوئی، گھر پر عربی فارسی کی تعلیم حاصل کی ،اول کلکٹری میں ملازمت مل گئی، محنت اور ایمانداری کے ساتھ اپنے فرائض انجام دینے کی وجہ سے ترقی کر کے تحصیلدار کے عہدے پر فائز ہوئے ، ملازمت کے دوران قانون کے موضوع پر ان کی دو تصنیفات سامنے آئیں جس کی وجہ سے انھیں ڈپٹی کلکٹر بنا دیا گیا، ان کی کارکردگی کی شہرت اٹاوہ سے حیدرآباد تک پہنچ گئی جس کی وجہ سے وہ حیدرآباد میں مالیات کے معتمدِ اعلی کے عہدے پر فائز ہوئے اور تین ہزار روپیہ ماہانہ ان کی تنخواہ مقرر ہوئی اور حسنِ خدمات کے اعتراف میں انھیں محسن الملک کا خطاب ملا۔حیدرآباد میں ان کی ایسی عزت تھی کہ بے تاج بادشاہ کہلاتے تھے،۱۸۹۳ میں وہ پنشن لیکر علی گڑھ چلے آئے اور باقی زندگی کالج کی خدمت میں گزاری، وہ سرسید کے رفیق اور جانشیں ہوئے اور ان کا انتقال ۱۹۰۷ میں شملہ میں ہوا مگر انھیں علی گڑھ لاکر سرسید کے پہلو میں دفن کیا گیا۔محسن الملک کو سرسید کا دستِ راست کہا جائے تو درست ہے، انھوں نے ہر قدم پر سرسید کے ساتھ تعاون کیا اور اپنے قلم سے سرسید کے افکار وخیالات کو پھیلانے کی کوشش کی، ان کے مضامین تہذیب الاخلاق میں اکثر شائع ہوتے تھے، ان کی نثر بہت شگفتہ اور دل کش ہوتی تھی، مضمون کے ایک ایک لفظ پر ان کی نظر ہوتی تھی اور وہ بہت سوچ سمجھ کر لفظوں کا انتخاب کرتے تھے، اس لیے وہ جو لکھتے تھے وہ حسین اور دل نشیں ہوتا تھا، ان کے خطوط کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے اور اہلِ ذوق اس مجموعے کو دل چسپی کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ علامہ شبلی جیسی شخصیت بھی ان کی دل کش تحریر کی قائل تھی۔

چراغ علی (۱۸۴۶۔۱۸۹۵ء)

چراغ علی کا آبائی وطن کشمیر تھا لیکن ان کے دادا ملازمت کے سلسلے میں پنجاب چلے آئے تھے، کچھ عرصہ بعد انھوں نے میرٹ میں سکونت اختیار کرلی ، یہیں ۱۸۴۶ء میں چراغ علی کی ولادت ہوئی ،صرف دس برس کے تھے کہ یتیم ہوگئے، والدہ نے پرورش کی مگر تعلیم خاطر خواہ نہ ہوسکی ، اردو فارسی کے علاوہ انگریزی بھی سیکھی مگر واجبی سی ، معاشی حالت اچھی نہیں تھی، ضلع بستی میں بیس روپیہ ماہوار پر سرکاری ملازمت کرلی،علم کی پیاس بے حساب تھی ، مطالعہ کا شغل جاری رہا ، یہاں تک کہ عربی فارسی کے علاوہ انگریزی ، لاطینی اور یونانی زبانوں میں

مہارت حاصل کرلی۔

لیاقت، صلاحیت اور علمی ذوق کی شہرت حیدرآباد تک پہنچی ، اس زمانے میں تمام جوہرِ قابل کو حیدرآباد بلانے کی کوشش ہوتی تھی ، چنانچہ ان کو بھی حیدرآباد بلاگیا اور مددگار معتمد مالگزاری کا عہدہ ان کے سپرد کیا گیا، پھر وہ ترقی کرکے معتمد کے عہدے تک پہنچے، علم کا شوق اور مطالعہ کا ذوق ہوتو انسان ہر جگہ اپنا یہ شغف جاری رکھ سکتا ہے ، انھوں نے نہ صرف کتابوں کا مطالعہ جاری رکھا بلکہ مختلف موضوعات پر کتابیں بھی لکھیں جن کی افادیت کوسب نے تسلیم کیا، وہ تہذیب الاخلاق میں بھی برابر مضامین لکھتے رہے ، مذہب اور اخلاق ان کا خاص موضوع تھا اور بہت سے معاملات میں وہ سرسید کے ہم خیال تھے اور جس طرح سے سرسید کے بہت سے افکار و نظریات کوتنقید کا ہدف بنایا گیا اسی طرح سے چراغ علی کے نظریات پر بھی لوگوں نے تنقیدیں کیں ۔ چراغ علی کا ذہن تحقیقی تھااور وہ جو کچھ لکھتے تھے غور وفکر کے بعد لکھتے تھے اوراس میں استدلالی رنگ پایا جاتا تھا۔ چراغ علی کا انتقال ۱۸۹۵ میں بمبئی میں ہوا۔

محمد حسین آزاد (۱۸۳۰۔۱۹۱۰)

اردو نثر کوخوبصورت ، بال و پر عطا کرنے والوں کی مختصر ترین فہرست بھی اگر بنائی جائے گی تو اس فہرست میں محمد حسین آزاد کا نام ضرور آئیگا، انھوں نے کئی قابلِ قدر کتابیں لکھیں جو آج بھی شوق کے ہاتھوں لی جاتی ہیں،اور انھیں سرمہ چشم بنایا جاتا ہے،''آبِ حیات'' ان کا لازوال کارنامہ ہے جواردوشاعری کی باقاعدہ تاریخ ہے جس میں ادوار قائم کرکے اردوشاعری کے آغاز وارتقا کا جائزہ لیا گیا ہے۔آبِ حیات میں شاعروں کے حالات دل کش انداز میں پیش کیے گیے ہیں، کتاب میں شعرا پرتنقید بھی ہے،اس لیےاس کتاب کواردوتنقید کا نقطہء آغاز بھی قرار دیا گیا ہے، محمد حسین آزاد کا دوسرا بے مثال کارنامہ ان کے وہ رمزیہ مضامین ہیں جو''نیرنگِ خیال'' میں شامل ہیں،ان کی ایک اور کتاب سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ ہے، ان کی تصنیفات میں ایک بہت اہم تصنیف ''دربارِ اکبری'' ہے، یہ شہنشاہ اکبر کے زمانے کی دل چسپ تاریخ ہے، انداز ایسا ہے کہ اس عہد کی تصویر آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتی ہے، ان کی ایک اوراہم تصنیف ''سخن دانِ فارس'' ہے،اس کتاب میں انھوں نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ فارسی اور سنسکرت دونوں کی بنیاد ایک ہے، بچوں کے لیے انھوں نے ''قصص ہند'' کے نام سے کہانیاں لکھی ہیں جن کا تعلق ہندوستان کی تاریخ سے ہے۔

طرزِ تحریر، اسلوب کی دل کشی اور حسن ادا کے اعتبار سے محمد حسین آزاد کی نثر لاجواب اور بے مثال ہے، اس میں سادگی بھی ہے اور پرکاری بھی، شگفتگی اور شیرینی ایسی کہ کتاب کو ہاتھ سے چھوڑنے کا جی نہ چاہے، ان کی

تحریر میں عجب تاثیر اور تسخیر کی صلاحیت ہے، جملے اتنے دل کش کہ دل میں اتر جائیں، شبلی جیسے ادیب نے بھی ان کے بارے میں یہ لکھا کہ ''محمد حسین آزاد اگر گپ بھی ہانک دیں تو وحی معلوم ہوتی ہے'' الفاظ ومحاورات کا صحیح استعمال اور مناسب استعارہ وتشبیہ سے عبارت کو مزین کرنا ان کی وہ خصوصیت ہے جو ان کو دوسروں سے ممتاز کرتی ہے۔

الطاف حسین حالیؔ (۱۸۳۷۔۱۹۱۴)

اردو نثر کے فروغ میں مولانا الطاف حسین حالیؔ کا بہت بڑا حصہ ہے، بلا شبہ وہ بہت اچھے شاعر تھے اور مسدس حالیؔ ایک ناقابلِ فراموش طویل ترین نظم ہے ۔لیکن اسی کے ساتھ بحیثیت نثر نگار بھی ان کا مرتبہ بہت بلند ہے۔انھوں نے اردو میں کئی کتابیں لکھیں، ان کی پہلی نثری تصنیف ''مجالس النساء'' ہے، اس کا موضوع عورتوں کی تربیت اور تعلیم ہے، لیکن انداز قصہ گوئی اور ناول کا ہے۔ اس کے بعد انھوں نے مشہور فارسی شاعر کی سیرت ۱۸۸۲ء میں ''حیات سعدیؔ'' کے نام سے لکھی، اس میں شاعر کے مستند حالات پیش کیے۔اس کے بعد انھوں نے غالبؔ کی سوانح ''یادگارِ غالبؔ'' کے نام سے لکھی، یہ غالب شناسی کی جانب پہلا قدم ہے اور اس میں انھوں نے غالبؔ کی شاعرانہ عظمت کا ثبوت بہت بہتر طریقہ سے دیا ہے۔سوانح عمری مولانا حالیؔ کا پسندیدہ موضوع بن گیا ، مذکورہ بالا دونوں کتابوں کے بعد انھوں نے ''حیاتِ جاوید'' کے نام سے سرسید کی مبسوط اور ضخیم سوانح عمری لکھی ۔الطاف حسین حالیؔ کا شریفانہ مزاج اور روایتی وضع داری ان کو تنقید پر آمادہ نہیں کرتی تھیں، چنانچہ انھوں نے غالبؔ اور سرسید دونوں پر کہیں تنقید نہیں کی ہے، یہاں تک کہ شبلیؔ نے حیاتِ جاوید کو مدلل مداحی اور کتاب المناقب کا نام دے دیا۔شبلیؔ کی تنقید اپنی جگہ پر، لیکن سوانح نگاری کے میدان میں یادگارِ غالبؔ اور حیاتِ جاوید کی اہمیت باقی اور برقرار ہے،مولانا حالی کی فن شاعری پر ناقدانہ بصیرت کا مظہر ان کی کتاب ''مقدمۂ شعروشاعری'' ہے۔آل احمد سرور نے اس کتاب کو اردو شاعری کا پہلا منشور قرار دیا ہے، انھوں نے اس کتاب میں بتایا ہے کہ اچھی شاعری کے لیے کیا شرطیں ہیں اور شاعری میں کیا خوبیاں ہونی چاہئیں، کتاب کے دوسرے حصے میں شعری اصناف یعنی غزل،قصیدہ،مرثیہ اور مثنوی کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ مولانا حالیؔ کی نثر میں سادگی بھی ہے اور پرکاری بھی ہے، شگفتگی بھی ہے اور تاثیر بھی ہے، وہ اپنی بات کو واضح اور مدلل طور پر بیان کرتے ہیں، آگے چل کر اردو میں جس سادہ نثر کو رواج ہوا اس کی بنیاد حالیؔ کی نثر ہے، یہ درست ہے کہ حالیؔ کی نثر میں شبلیؔ کی زبان کی شگفتگی اور رعنائی نہیں ہے اور نہ مولوی نذیر احمد کا زورِ بیان ہے لیکن ان کی سادہ نثر بھی بہت دل کش اور مؤثر ہے۔

نذیر احمد (۱۸۳۶ـ۱۹۱۲ء)

مولوی نذیر احمد کو اردو کا پہلا ناول نگار تسلیم کیا جاتا ہے لیکن انھوں نے ناول کے علاوہ بھی بہت کچھ لکھا ہے، قرآن مجید کا با محاورہ ترجمہ کیا، مذہب و اخلاق سے متعلق کتابیں تصنیف کیں، انھوں نے بعض انگریزی کتابوں کے اردو ترجمے بھی کیے، یہ وہ کتابیں ہیں جن کا تعلق قانون سے ہے، جیسے ایک ترجمہ کا نام ہے ''تعزیراتِ ہند'' اور دوسرے ترجمہ کا نام ہے ''قانونِ شہادت''۔

ڈپٹی نذیر احمد ادیب بھی تھے اور خطیب بھی تھے، ان کے خطبات بھی شائع ہو چکے ہیں، ان کی تحریروں اور تقریروں میں بلا کا زور اور جوش پایا جاتا ہے، کیونکہ وہ عربی کے بڑے عالم تھے، اس لیے عربی زبان کے اثرات ان کی اردو نثر پر بہت زیادہ ہیں، ان کو ''شمس العلماء'' کا خطاب بھی دیا گیا اور ایڈنبرا یونیورسٹی سے ایل ایل ڈی کی اعزازی ڈگری بھی دی گئی۔ ڈپٹی نذیر احمد کی شہرت ان کے ناول ''مرآۃ العروس'' اور ''بنات النعش'' اور ''توبۃ النصوح'' اور ''ابن الوقت'' کی وجہ سے ہے۔ نذیر احمد کو اردو کے پہلے ناول نگار کا درجہ دیا جاتا ہے، ان کے مکالمے بہت لاجواب ہیں اور یہ ناول اصلاحی مقصد کے لیے لکھے گئے ہیں، تہذیب اخلاق کو ان کے یہاں ایک بنیادی حیثیت حاصل ہے اور ان کی تمام تصانیف جدید نثری صنف کا سنگ بنیاد ہیں۔

ذکاء اللہ (۱۸۳۲ـ۱۹۱۰ء)

منشی ذکاء اللہ دہلی کے رہنے تھے، والد کا نام ثناء اللہ تھا، ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی، اس کے بعد دہلی کالج میں داخلہ لیا، اس کالج میں نذیر احمد اور محمد حسین آزاد پہلے سے زیر تعلیم تھے، ادبی اور شعری ذوق کے مشترک ہونے کی وجہ سے ان تینوں کے درمیان زمانۂ طالب علمی سے ہی دوستانہ مراسم قائم ہو گیے اور جب بچپن کے زمانے سے اہلِ فن اور شعر و ادب کا ذوق رکھنے والوں سے شناسائی ہو جاتی ہے تو یہ ذوق بھی پروان چڑھتا ہے اور جس کے نتیجے میں ایک انسان اچھا شاعر یا اچھا ادیب بن جاتا ہے۔ منشی ذکاء اللہ نے اردو اور فارسی بھی پڑھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کو علم ریاضی سے بھی شغف تھا، چنانچہ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد اسی کالج میں ریاضی کے پروفیسر ہوئے۔ انھوں نے بہت سے مضامین سپرد قلم کیے اور کتابوں کا انبار لگا دیا۔ بعض محققین نے لکھا ہے کہ ان کی جملہ تصانیف کی تعداد ایک سو تینتالیس تھی، ان کی تمام تصانیف میں غالباً سب سے اہم کتاب ''تاریخ ہندوستان'' ہے جو دس جلدوں میں ہے، انھیں بھی ''شمس العلماء'' کا خطاب دیا گیا، ان کی تمام کتابیں پر از معلومات ہیں لیکن حسنِ بیان اور شگفتگی زبان کے اعتبار سے نذیر احمد اور محمد حسین آزاد کی کتابوں کے درجے کی نہیں ہیں، وہ آخر میں

الہ آباد کے کالج میں عربی فارسی کے پروفیسر بھی ہوگیے تھے ، ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور وہ جب بھی لکھتے تھے تو معلومات کا انبار لگا دیتے تھے۔

علامہ شبلی (۱۸۵۷۔۱۹۱۴ء)

علامہ شبلیؔ کی شخصیت ایسی نابغۂ روزگار شخصیت ہے کہ جنہیں نہ کوئی اسلامیات کا طالبِ علم نظر انداز کرسکتا ہے اور نہ تاریخ کا اور نہ اردو زبان وادب کا اور نہ فارسی زبان وادب کا۔ ان کا انتقال صرف ستاون برس کی عمر میں ہوا لیکن اس قلیل مہلتِ عمر میں انھوں نے جو علمی کارنامے انجام دئے ان کی وجہ سے ان کو حیاتِ جاوداں مل گئی ہے اور ان کے قلم سے ایسی لاجواب تصنیفات وجود میں آئی ہیں کہ جن کی وجہ سے ان کا نام گردشِ شام وسحر کی زنجیر سے آزاد ہوگیا ہے۔ ان کی پیدائش اعظم گڑھ میں ہوئی۔ انھوں نے مولوی محمد فاروق چریا کوٹی اور دوسرے اساتذہ سے تعلیم حاصل کی، انھوں نے علم کے حصول کے لیے مختلف شہروں اور مختلف ملکوں کے سفر کیے، جب وہ علی گڑھ گیے تو سرسید نے اس جوہرِ قابل کو پہچانا اور یونیورسٹی میں ان کو جگہ دی۔ شبلیؔ نے سرسید کے کتب خانہ سے خاص طور پر فائدہ اٹھایا اور الطاف حسین حالیؔ اور محسن الملک اور آرنلڈ کی علمی صحبتوں سے مسلسل مستفید ہوئے، انسان کو اگر علمی ذوق ودیعت کیا گیا ہو اور مناسب ماحول بھی اس کو میسر آجائے تو بہت جلد اس کی شہرت شمیم گل کی طرح چمن میں پھیل جاتی ہے۔ وہ ندوہ میں رہے تو ''الندوہ'' نکالا اور مولانا آزاد کو اس کا اڈیٹر مقرر کیا، سید سلیمان ندوی اور دوسرے طلبا کی علمی اور ادبی تربیت کی، انھوں نے بہت سی کتابیں لکھیں جن میں ''سیرۃ النبی'' ''الفاروق'' ''المامون'' ''شعر العجم'' اور ''موازنۂ انیس ودبیر'' اور ''علم الکلام'' بہت اہم ہیں۔ شبلیؔ شاعر بھی بہت اچھے تھے، انھوں نے جو تاریخی نظمیں کہی ہیں وہ ناقابل فراموش ہیں، نثر میں وہ ایک اسلوب کے بانی ہیں، ان کی زبان میں شگفتگی و رعنائی ہے، انھوں نے دار المصنفین کی شکل میں ایک علمی ودینی تصنیفی ادارہ امت کو دیا اور مولانا سید سلیمان ندوی نے اس ادارے کو شہرت کی بلندیوں تک پہنچایا۔ دار المصنفین کی تمام کتابیں علمی اعتبار سے اور زبان و بیان کے اعتبار سے اہم درجہ رکھتی ہیں، علامہ شبلیؔ کے مضامین اور مکاتیب کا مجموعہ بھی شائع ہوگیا ہے۔

شبلیؔ نے مذکورہ بالا تصانیف کے علاوہ اور بھی کتابیں تصنیف کی ہیں جیسے ''اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر'' اور ''حیاتِ خسرو'' اور ''سفرنامۂ روم وشام ومصر'' اور ''الجزیہ'' اور ''فلسفۂ اسلام''، انھوں نے مضامین بھی بہت کثرت سے لکھے ہیں۔ ان مضامین سے ان کی نثر کے حسن اور جاذبیت و شگفتگی کا اندازہ ہوتا ہے اور اسلوب کی انفرادیت ظاہر ہوتی ہے، شبلیؔ قدیم روایات کے پاسدار اور قومی مزاج کے شناسا تھے، سرسید نے اسلام کا مطالعہ عصری

مغربی فکری معیارات کے نقطہ نظر سے کیا اور شبلی نے مغربی اقدار کو اسلامی نقطہ نظر سے جانچنے کی کوشش کی، شبلی نے علم الکلام کی تحقیق اور اجتہاد کو ہمیشہ اہمیت دی اور اسی بنا پر انھوں نے اپنی فکری زندگی کا آغاز ''سیرۃ النعمان'' کی تصنیف سے کیا، شبلی نے فن سیرت نگاری میں درجۂ کمال کو چھولیا ہے، ''المامون'' سیرت النعمان، الفاروق، الغزالی، سوانح مولانا روم، سیرت النبی ان کی شاہکار کتابیں ہیں اور عالمانہ تحقیق کا نمونہ ہیں، سیرت النبی ان کی آخری تصنیف ہے جس کے شروع میں انھوں نے یہ اشعار لکھے ہیں:

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں لکھی
مجھے چندے مقیمِ آستانِ غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرتِ پیغمبرِ خاتم
خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

علامہ سید سلیمان ندوی (۱۸۸۴۔۱۹۵۳ء)

علم و ادب کی گرانقدر خدمت اور تحقیقی کاموں کی بدولت مولانا سید سلیمان ندوی کا شمار اپنے عہد کے ممتاز مصنفین میں ہوتا ہے، ان کے خاندان کا تعلق بہار شریف کے گاؤں دسنہ سے تھا، ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی، ۱۹۰۱ء میں دارالعلوم ندوۃ العلما میں داخلہ لیا، جہاں ان کو علامہ شبلی سے علمی استفادہ کا موقع ملا، علامہ شبلی بھی ان کے علمی خلوص اور کام کی لگن سے متاثر تھے اور انھوں نے مولانا سلیمان ندوی کو ''الندوہ'' کی ذمہ داری سونپی، جب جولائی ۱۹۱۲ء میں مولانا ابوالکلام آزاد نے کلکتہ سے الہلال جاری کیا تو مولانا سید سلیمان ندوی کو مجلس ادارت میں شامل کیا، انھوں نے الہلال میں ادبی انداز میں مؤثر مضامین لکھے، وہ دکن کالج پونہ فارسی کے اسٹنٹ لکچرار مقرر ہوئے، وہاں انھوں نے انگریزی سیکھی اور اس میں مہارت پیدا کرلی اور اسی جگہ انھوں نے اپنی مشہور کتاب ارض القرآن کا پہلا حصہ مکمل کرلیا، ابھی تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ علامہ شبلی کا انتقال ہوگیا، انھوں نے سیرت النبی کا نامکمل کام مولانا سید سلیمان ندوی کے سپرد کیا، شبلی کی خواہش تھی کہ دارالمصنفین کے نام سے ایک ایسے ادارے کا قیام عمل میں لایا جائے جو صرف تصنیف وتالیف کے لیے مختص ہو۔ دارالمصنفین کے لیے شبلی نے اپنا گھر اور باغ وقف کردیا، مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنے استاد کے لگائے ہوئے اس چمن کی آبیاری کی اور اسے رشکِ صد گلستاں بنادیا، مولانا سید سلیمان ندوی کے ساتھ ان کے اور دیگر رفقاء بھی تھے جنھوں نے دارالمصنفین کی علمی شہرت میں اضافہ کیا جیسے مولانا عبد السلام ندوی اور ریاست علی ندوی اور شاہ معین الدین ندوی وغیرہ، مولانا سید سلیمان ندوی نے دارالمصنفین سے علمی ماہنامہ ''معارف'' نکالا اور اب سو سال ہورہے ہیں یہ وقیع علمی رسالہ پابندی کے ساتھ آج بھی شائع ہوتا ہے، اردو زبان وادب کی تاریخ میں کوئی بھی علمی رسالہ ایسا نہیں ہے جس نے اپنی عمر کے سو سال پورے کیے ہوں۔

مولانا سید سلیمان ندوی کی علمی اور تاریخی تحقیق کا شاندار نمونہ ان کی کتاب ''خیام'' ہے، انھوں نے شبلی کی تصنیف سیرت النبی کو مکمل کیا اور اس کی مزید چھ جلدیں تیار کیں، سیرت پر اتنا وقیع کام دوسری زبانوں میں بھی نہیں ہوا ہے، سیرت پر ان کی دوسری کتاب ''خطباتِ مدراس'' ہے اور یہ کتاب سیرت کے موضوع پر ان کے علمی خطبات کا بے نظیر مجموعہ ہے، اس کی مقبولیت آج تک باقی ہے، اس کے علاوہ سیرتِ عائشہ اور حیاتِ شبلی ان کی اہم کتابیں ہیں، حیاتِ شبلی صرف شبلی کی سوانح حیات نہیں ہے بلکہ ایک پورے عہد کی علمی اور ثقافتی تاریخ کی دستاویز ہے، یادِ رفتگاں ان کے وہ خاکے ہیں جو وہ معارف میں لکھا کرتے تھے، مولانا سید سلیمان ندوی کی زبان بہت دل کش اور دل آویز ہے، مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالسلام ندوی شبلی کے خاص شاگرد تھے، وہی علمیت، وہی اندازِ تحقیق اور وہی زبان و بیان کی شگفتگی ۔ جس طرح علامہ شبلی کے خاص شاگرد مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا عبد السلام ندوی تھے، اسی طرح علامہ سید سلیمان ندوی کے خاص شاگرد سید صباح الدین عبدالرحمٰن تھے ۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی بھی ان لوگوں میں ہیں جنھوں نے سید سلیمان ندوی کے خرمنِ ادب سے خوشہ چینی کی ہے اور انھوں نے ان سے استفادہ اور خوشہ چینی کا اعتراف کیا ہے۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی عربی زبان کے بھی بلند پایہ ادیب تھے اور جب عالمی سطح پر رابطہ ادبِ اسلامی کا قیام عمل میں آیا تو متفقہ طور ادباء اور شعراء نے انکو اس عالمی ادبی تحریک کا صدر بنایا۔ گلِ رعنا کا مقدمہ ان کے ادبی ذوق اور اردو انشاپردازی کا نمونہ ہے۔

سجاد انصاری (متوفی ۱۹۲۴ء)

سجاد انصاری کا تعلق اس نوجوان نسل سے تھا جسے علی گڑھ میگزین نے پروان چڑھایا تھا، انہیں شاعری سے بھی دل چسپی تھی لیکن انہیں شہرت اس نثر سے ملی جو نہ افسانہ ہے نہ انشائیہ نہ تنقید لیکن اس نثر میں ان سب اصناف کی خوبیاں موجود ہیں، یہ ایسی رومانی نثر ہے جو اپنی داخلی اوصاف کی بناء پر شاعری کا درجہ رکھتی ہے، سجاد انصاری کے نثری مضامین کا مجموعہ ''محشر خیال'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے، ان کی نثر کو پڑھ کر شگفتن گل ہائے ناز کی کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے، فلسفہ اور ادب کے لطیف امتزاج کی وجہ سے اردو نثر میں انھوں نے اپنی شناخت قائم کی ہے، ان کا انتقال جوانی کے زمانے میں ہوا، ادبِ لطیف، انشائے جمیل اور ادب برائے ادب کا ذکر جب بھی آئیگا تو سجاد انصاری کی کتاب محشرِ خیال کا تذکرہ ضرور کیا جائے گا، سجاد انصاری صنفِ نازک، حسن و عشق اور زندگی کے حسین مناظر اور مظاہر کا تذکرہ فلسفیانہ انداز سے کرتے ہیں، ان کے یہاں آزادی خیال بھی پائی جاتی ہے، وہ اسکر وائلڈ کی طرح ادب برائے ادب کے نظریہ پر یقین رکھتے ہیں، ان

کا کہنا ہے کہ فرد کو پوری آزادی ملنی چاہئے کہ وہ ترک واختیار کے پیمانے خود بنائے اور انھوں نے یہ لکھا ہے کہ جماعت کو حق نہیں ہے کہ فرد پر اپنے قوانین مسلط کرے، سجاد انصاری کی تحریروں پر مذہبی حلقے سے تنقیدیں بھی کی گئیں، ان کا طرز فکر یہ ہے کہ ادب اور جمالیات کی تعبیر کو اپنے پسند کے انداز میں کرنا چاہئے اور کسی کو حق نہیں ہے کہ کاروبارِ شوق اور ذوقِ نظارۂ جمال پر پابندی عائد کرے، سجاد انصاری رنگینی، سرشاری اور دل فریبی کے دلدادہ ہیں، ان کی جمالیاتی حس بہت تیز اور گہری ہے۔

مہدی افادی (۱۸۷۰۔۱۹۲۱ء)

اردو نثر کو رومانی تحریک کی رنگینی ولطافت اور تابناکی سے روشناس کرانے والوں میں سجاد انصاری کے ساتھ مہدی افادی کا بھی نام لیا جاتا ہے، وہ ایک منفرد انشا پرداز تھے اور فکری رویّوں کے اعتبار سے امتیازی خصوصیت کے حامل ادیب تھے، انھوں نے عربی فارسی اور اردو زبانیں گھر پر سیکھیں اور ابتدائی انگریزی تعلیم مقامی اسکول میں حاصل کی اور پھر علی گڑھ میں تدریس کی منزلیں طے کیں، مہدی افادی ایک ذہین انسان تھے اور غور وفکر کے عادی تھے، اس لیے ان کی نظر نئے گوشوں پر پڑتی اور وہ ان پر اپنے منفرد انداز میں اظہارِ خیال کیا کرتے تھے، ان کی تحریروں میں ایک طرف شگفتگی اور شادابی ہے، دوسری طرف عقلیت ہے، ان دونوں کی آمیزش کی وجہ سے وہ اردو کے ممتاز اور صاحب طرز ادیب قرار دئے گیے، انھوں نے ''حکمائے یونان پر ایک سرسری نظر'' کے نام سے ایک وقیع مضمون ۱۸۹۷ء میں شائع کیا تھا، ان کے مضامین کا مجموعہ ''افادات مہدی'' کے نام سے بہت پہلے شائع ہو چکا ہے، وہ اردو ادب کے کلاسیکی روایات کا احترام کرتے ہوئے جدت کے پرستار تھے اور رومانیت پر اصرار کے باوجود عقلیت سے گریزاں نہیں تھے، وہ علی گڑھ تحریک اور تہذیب الاخلاق سے بھی متاثر تھے، ان کی تحریروں میں جذباتیت اور عقلیت اور رومانیت اور افادیت کا امتزاج نظر آتا ہے، مہدی افادی سرسید کے ساتھ شبلی کے بھی پرستار ہیں اور شبلی کے طرزِ تحریر کو بہت پسند کرتے ہیں، مہدی افادی نے بہت سے لوگوں کے اثرات کو قبول کیا، وہ ناصر علی کی رنگین اور پر لطف نثر کے بھی دل دادہ ہیں اور شبلی کے بھی پرستار ہیں اور سرسید کے بھی قائل اور معترف ہیں۔

ظفر علی خان (پیدائش ۱۸۷۰)

ظفر علی خان اردو صحافت کی تاریخ میں بلند مقام رکھتے ہیں، وہ ایک طویل عرصہ تک اخبار ''زمیندار'' کے اڈیٹر رہے اور حیدرآباد دکن میں ملازمت کے دوران ''رسالہ دکن ریویو'' اور ''ستارۂ صبح'' نکالا، زمیندار وہ اخبار تھا جس میں نیاز فتحپوری، مولانا غلام رسول مہر، عبداللہ عمادی اور عبدالمجید سالک جیسے ادیب مضامین لکھا کرتے تھے، مولانا ظفر علی خان شعلہ نوا مقرر تھے اور بدیہہ گو شاعر تھے

اور اسی کے ساتھ سیاسی رہنما اور قومی مبلغ بھی تھے، جب وہ اپنی پاٹ دار آواز سے تقریر کرتے تو دشت وجبل اور وادی وکوہسار گونج اٹھتے، اپنی شعلہ نوائی اور گرم تقریروں کی وجہ سے زمیندار کئی بار بند ہوا لیکن ادھر زمیندار بند ہوتا ادھر قوم کے تعاون سے پھر نکل آتا، زمیندار نے مسلمان قوم کو خود اعتمادی سکھائی، صحافت کے وسیلے سے ادب کے ساتھ فکاہات کا معیار بھی بلند کیا، زمیندار ایک طویل العمر اخبار تھا لیکن مولانا ظفر علی خان کے انتقال کے بعد وہ بھی زندہ نہ رہ سکا، وہ کانگریس، تحریک خلافت، اتحاد ملت اور مسلم لیگ سب کے روح رواں رہ چکے تھے، ان کی زبان میں سادگی اور پرکاری اور تشبیہات و استعارات کی رنگینی یہ ساری چیزیں موجود ہیں، ان کی عبارتوں میں ادبیت کی شان ہے، ''حقائق ومعارف''، ''جواہر الادب''، ''حقیقت وافسانہ'' ان کی کتابیں ہیں، ان کے علاوہ ''بہارستان'' ''نگارستان'' اور ''چمنستان'' ظفر علی خان کے کلام کے مجموعے ہیں۔

مولانا عبد الماجد دریا آبادی

(۱۸۹۲ـ۱۹۷۷ء)

مولانا عبد الماجد دریا آبادی اپنی علمیت، اپنے صحافتی تبصرے اور فلسفیانہ بصیرت اور ادبی ژرف نگاہی کی وجہ سے ادبی دنیا میں فراموش نہیں کیے جاسکیں گے ان کی تصنیفات کا دائرہ بہت وسیع ہے، وہ قرآن مجید کے مترجم اور مفسر بھی ہیں، شروع میں ان کے قلم سے کئی کتابیں نکلیں جیسے فلسفۂ جذبات اور فلسفہ اجتماع، ان دونوں کو انھوں نے اپنی تصنیفات کی فہرست سے خارج کردیا تھا، وہ ادیب بھی تھے اور مصلح اور مفکر بھی تھے، کئی برس تک پہلے ہفتہ وار ''سچ'' اور پھر ''صدقِ جدید'' کے نام سے جریدہ نکالتے رہے، جس میں ان کے شذرات بہت قیمتی ہوتے تھے اور پورے ملک میں پڑھے جاتے تھے، وہ حیدرآباد کے دار الترجمہ سے بھی وابستہ رہے، انہیں فلسفہ اور منطق کی کتابوں کے مترجم کی حیثیت سے بلایا گیا تھا، ان کی کتابوں میں ''محمود غزنوی'' ''مکالماتِ برکلے'' ''مبادی فلسفہ'' اور ''فلسفہ اور اس کی تعلیم'' بہت اہم ہیں، مولانا دریا آبادی کا خالص ادبی اسلوب ''سفر نامۂ حجاز'' اور ''محمد علی ذاتی ڈائری'' میں بہت نمایاں ہے، ''آپ بیتی'' کے نام سے انھوں نے اپنی سرگزشت بھی لکھی ہے، سیرت پر ان کے مضامین اور نشری تقریروں کا مجموعہ ''مردوں کی مسیحائی'' کے نام سے شائع ہوگیا ہے، ''مقالاتِ ماجد'' اور ''انشائے ماجد'' بھی مولانا کے مضامین کے مجموعے ہیں، انھوں نے ''تفسیر ماجدی'' اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں لکھی ہے، انھوں نے جو خاکے لکھے ہیں ان کا مجموعہ ''معاصرین'' کے نام سے شائع ہوگیا ہے، انھوں نے پوری زندگی علم وادب کی خدمت میں گزاری اور اردو ادب کی تاریخ میں ناقابلِ فراموش خدمات انجام دیں۔ انھوں

نے خودنوشت ''آپ بیتی'' کے نام سے لکھی ہے۔

قاضی عبد الغفار (۱۸۸۵۔۱۹۵۴ء)

قاضی عبدالغفار ایک صاحبِ طرز ادیب، صحافی اور انشائیہ نگار تھے۔ انھوں نے اردو نثر کو اپنے خاص اسلوب کی وجہ سے منفرد پہچان عطا کی ہے، وہ اردو تحریک کے پر جوش کارکن تھے، مرادآباد ان کا وطن تھا، ابتدائی تعلیم کے بعد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں انھوں نے داخلہ لیا، قاضی عبدالغفار کو شروع ہی سے صحافت سے دل چسپی تھی، مرادآباد سے ایک رسالہ ''نیّر عالم'' شائع ہوتا تھا اس میں ان کی بعض تحریریں شائع ہوئی تھیں، ۱۹۱۳ء میں مولانا محمد علی جوہر نے اپنے اخبار ہمدرد میں اپنا اسسٹنٹ مقرر کرلیا، اس طرح سے قاضی عبدالغفار کو مولانا محمد علی کی تربیت سے فیض یاب ہونے کا موقع ملا، جب حکومت نے ہمدرد کو بند کردیا تو قاضی عبدالغفار کلکتہ آگئے اور وہاں سے انھوں نے روزنامہ ''جمہور'' جاری کیا، انگریزی حکومت نے جمہور پر بھی پابندی عائد کردی تو قاضی عبدالغفار نے دہلی سے روزنامہ ''صباح'' جاری کیا، یہاں ان کو حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری کی صحبت حاصل ہوئی اور جب خلافت کمیٹی کا وفد لندن جانے لگا تو ان کو اس وفد کا ایک رکن بنایا گیا، وہ چودہ فروری ۱۹۲۱ء کو وفد کے ساتھ لندن پہنچے اور تقریباً ڈھائی مہینے کے بعد ہندوستان واپس ہوئے، یہ چونکہ مرادآباد کے تھے اور ہر شخص کو اپنا شہر اور اپنے شہر کی صنعت وحرفت عزیز ہوتی ہے، اس لیے انھوں نے پیرس میں مرادآبادی برتنوں کی دکان کھولنے کی کوشش کی، لیکن ایک ادیب اور دانشور تاجر اور ساہوکار نہیں بن سکتا، چنانچہ انھوں نے برتنوں کی دکان بند کی، بعد میں وہ ساہتیہ اکیڈمی کے رکن نامزد ہوئے اور انجمن ترقی اردو کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے اردو کی خدمت انجام دی۔

قاضی عبدالغفار نے ایک صحافی کی حیثیت سے اپنی شناخت قائم کی تھی لیکن ان کا اصل مقام یہ تھا کہ وہ اردو کے صاحبِ طرز ادیب تھے، ''لیلی کے خطوط'' ''مجنون کی ڈائری''، ''تین پیسے کی چھوکری''، ''پندار کا صنم کدہ''، ''سیب کا درخت''، ''نقش فرنگ''، ''آثارِ جمال الدین افغانی''، ''آثارِ ابوالکلام آزاد''، اور ''حیاتِ اجمل'' ان کی شاہکار کتابیں ہیں۔ انھوں نے حیدرآباد سے ''پیام'' نام کا اخبار بھی نکالا تھا اور اس اخبار میں انھوں نے ''سرراہ'' کے عنوان سے طنزیہ اور مزاحیہ کالم بھی لکھنا شروع کیا تھا، انھوں نے صحافت کے ذریعہ رائے عامہ کی رہنمائی کا کام انجام دیا، ان کا طرزِ تحریر شگفتہ اور پر اثر ہوتا تھا، لیلی کے خطوط قاضی عبدالغفار کا شاہکار تصور کیا جاتا ہے، ان خطوط میں حسنِ بیان اور شگفتگی غیر معمولی ہے، اسی طرح سے مجنوں کی ڈائری بھی ایک اہم کتاب ہے، ان کی تحریریں انشائیہ اور ادبِ لطیف کا اچھا نمونہ ہیں، سوانحی ادب میں بھی ان کے قلم کی کاوشیں نمایاں ہیں، چنانچہ انھوں نے

مولانا آزاد اور حکیم اجمل خاں اور جمال الدین افغانی کی سوانح قلم بند کی ہیں۔

خواجہ حسن نظامی (۱۸۷۸۔۱۹۵۵ء)

اردو کے صاحبِ طرز ادیبوں کی کوئی مختصر فہرست خواجہ حسن نظامی کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی، وہ ایک زود نویس اور کثیر التصانیف ادیب تھے ، انھوں نے انشائیے ، سفرنامے اور روزنامچے لکھے، تفسیر بھی لکھی، صحافت سے بھی اپنا رشتہ قائم کیا، ایک سوانح نگار اور مرقع نگار کی حیثیت سے بھی اپنی انفرادیت تسلیم کروائی ، ان کے اسلوب کی آب وتاب بدستور باقی ہے، تصوف کے مشائخ کے خاندان سے ان کا تعلق تھا، وہ گیروا لمبا کرتہ پہنتے تھے، انھوں نے حلقہ نظام المشائخ قائم کیا اور نظام المشائخ کے نام سے رسالہ بھی جاری کیا، اسی رسالہ میں ان کا سفرنامہ شام بھی شائع ہوا، انھوں نے نثر کے مختلف اصناف میں اپنی تخلیقی یادگاریں چھوڑی ہیں ’’آپ بیتی‘‘، ’’بیگمات کے آنسو‘‘، ’’سیپارۂ دل‘‘، ’’بہادر شاہ ظفر کا روزنامچہ‘‘، ’’جگ بیتی کہانیاں‘‘ ، ’’چار درویشوں کا تذکرہ‘‘، ’’دلی کی جانکنی‘‘، ’’سفرنامۂ حجاز‘‘، ’’مصر وشام‘‘، ’’طب کی تاریخ‘‘، ’’طمانچہ بر رخسارِ یزید‘‘ وغیرہ ان کی تصنیفات ہیں، انھوں نے ایک عام فہم تفسیر بھی لکھی ہے، ان کا ایک اور تاریخی اور ادبی کارنامہ ’’فرعونی تاریخ‘‘ ہے، انھوں نے اپنی آپ بیتی بھی لکھی ہے، ’’میلادنامہ‘‘ کے نام سے سیرتِ رسول (ﷺ) لکھی ہے اور حضرت عبدالقادر جیلانی کی سوانح عمری بھی قلم بند کی ہے۔ خواجہ حسن نظامی کے مضامین میں خاص بات یہ ہوتی ہے کہ وہ معمولی سے معمولی چیز سے کوئی سبق لیتے ہیں اور لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں، ان کی فکر رسا اور مشاہدہ زرخیز ہے، مناظرِ قدرت سے بھی ان کی جذباتی وابستگی ہے۔ وہ صبح دوپہر شام سردی وگرمی و برسات کی کیفیات اپنے خاص انداز میں بیان کرتے ہیں، ان کی جمالیاتی حس بہت تیز ہے اور وہ فطرت کی رنگارنگی میں ڈوب کر اس کے بوقلموں جلووں کی مصوری کرتے ہیں ، اور جس موضوع پر بھی قلم اٹھاتے ہیں اس میں کوئی نہ کوئی عارفانہ نکتہ اور کوئی درس تلاش کر لیتے ہیں، ان کا طرزِ نگارش سلیس، عام فہم اور دل نشیں ہے۔

مولانا ابو الکلام آزاد (۱۸۸۸۔۱۹۵۸ء)

مولانا آزاد کے والد کا نام خیر الدین تھا جو ہندوستان کی زبوں حالی کو دیکھ کر ہجرت کر کے سرزمینِ حجاز چلے گیے تھے، وہیں مولانا آزاد کی پیدائش ہوئی ، بعد میں ان کے والد خیر الدین اپنے علاج کے سلسلے میں کلکتہ آئے تو پھر واپس نہیں گیے۔ مولانا آزاد نے ابتدائی تعلیم وتربیت مختلف اساتذہ سے یہیں کلکتہ میں حاصل کی ، مولانا آزاد نے بعد میں انگریزی بھی سیکھی اور اتنی سیکھی کہ انگریزی زبان کی علمی کتابوں کا مطالعہ کرنے لگے ، ان کی میز پر انگریزی زبان کی علمی کتابیں رکھی رہتی تھیں ،۱۹۱۲ء میں

مولانا آزاد نے ''الہلال'' جاری کیا جو حق گوئی و بے باکی کا مرقع تھا ، اس میں انگریزوں کی سیاسی پالیسی پر سخت تنقیدیں کی جاتی تھیں ، الہلال حکومت مخالف موقف کی وجہ سے زندگی اور موت کی کشمکش سے گزرتا رہا، بند ہوا تو بعد میں ''البلاغ'' کی شکل میں نمودار ہوا، ۱۹۲۷ء میں الہلال دوبارہ نکلا اور پھر کچھ عرصہ کے بعد مستقل طور پر بند ہو گیا، مولانا کو قید و بند کی زندگی گزارنی پڑی، ۱۹۱۶ء کو انہیں رانچی میں نظر بند کیا گیا اور چار سال کی نظر بندی کے بعد ۱۹۲۰ء میں انہیں رہا کیا گیا۔

مولانا ابو الکلام آزاد بہت بڑے ادیب ، زبردست عالمِ دین ، بلند مرتبہ سیاسی قائد اور غیر معمولی خطیب تھے، الہلال اور البلاغ کے علاوہ کئی کتابیں مثال کے طور پر ''تذکرہ''، ''ترجمان القرآن''، ''غبارِ خاطر'' اور ''کاروان خیال'' ان کی یادگار تصانیف ہیں، انھوں نے اپنی سیاسی زندگی کے نقوش ''انڈیا ونس فریڈم'' کے نام سے مرتب کیے ہیں جو ہندوستان کی آزادی کی تاریخ ہے ، الہلال میں مولانا نے جو آتشیں مقالات سپرد قلم کیے ان کا مجموعہ شائع ہو گیا ہے، یہ مقالات مسلمانوں کو بیدار کرنے اور ان کے اندر سیاسی شعور پیدا کرنے کے لیے لکھے گیے تھے ۔ ترجمان القرآن قرآن کریم کی تفسیر ہے ، وہ بائیس پاروں تک مکمل ہو سکی ، اس میں سب سے طویل تفسیر سورۂ فاتحہ کی تفسیر ہے ، غبارِ خاطر خطوط کا مجموعہ ہے ، مولانا ابو الکلام آزاد ایک نئے اسلوب کے بانی ہیں ، الہلال اور البلاغ میں ان کا اسلوب پر جوش اور ولولہ انگیز ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شعور کی بیداری کے لیے صور پھونکا جا رہا ہے ، غبارِ خاطر کا اسلوب مختلف ہے اس میں شیرینی اور نغمگی ہے۔ حسرتؔ موہانی نے مولانا آزاد کی نثر کی ستائش کرتے ہوئے یہ شعر کہا تھا:

جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر
نظمِ حسرتؔ میں بھی مزہ نہ رہا

ڈاکٹر عابد حسین (۱۸۹۵۔۱۹۷۸ء)

جامعہ ملیہ اسلامیہ کو مسلمانوں کے لیے ایک مستحکم ادارہ اور ایک مینارۂ نور اور نئی نسل کے خوابوں کی تعبیر بنانے کے لیے کئی اشخاص نے انتھک کوششیں کیں، ان شخصیات میں ڈاکٹر ذاکر حسین اور پروفیسر مجیب کے ساتھ ڈاکٹر عابد حسین کا نام بھی لیا جاتا ہے، ڈاکٹر عابد حسین بہت بڑے مفکر، سحر طراز انشا پرداز اور فلسفی تھے، انھوں نے مسلمانوں کے طرزِ فکر کو عصری رجحانات سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی، ان کو اسلام کی تہذیب کے ساتھ ہندوستان کی قومی تہذیب کا بھی شعور تھا اور اس موضوع پر ان کی کتاب ''قومی تہذیب کا مسئلہ'' بہت بلند پایہ علمی اور فکری کتاب ہے، اسی طرح سے انھوں نے ہندوستان میں حالیہ دور کی وہ تاریخ لکھی ہے جو مسلمانوں کے اردگرد گھومتی ہے اور یہ کتاب ''ہندوستانی مسلمان آئینہ ایام'' کے نام سے شائع

ہو چکی ہے، اس کتاب میں انگریزوں کے عہدِ اقتدار اور مختلف سیاسی کشمکش اور مسلمان شخصیتوں کا اس میں رول، مسلمانوں کی آزمائش کا دور اور مسلمان قائدین، ان تمام موضوعات پر بہت تفصیلی اور فکر انگیز گفتگو کی گئی ہے، اسلوب عالمانہ اور اسی کے ساتھ انشا پردازانہ ہے، جن لوگوں کو عہدِ حاضر میں اس ملک کے اندر مسلمانوں کی تاریخ جاننی ہو ان کو یہ کتاب ضرور پڑھنی چاہئے۔

۱۹۴۹ء میں ڈاکٹر عابد حسین کو جامعہ کا پرنسپل مقرر کردیا گیا، ۱۹۴۸ء میں انھوں نے ایک ہفت روزہ اخبار ''نئی روشنی'' کے نام سے جاری کیا جس کا مقصد مسلمانوں کی خود اعتمادی بحال کرنا تھا، یہ اخبار ۱۹۵۰ء تک جاری رہا، کئی سال تک وہ علی گڑھ میں جنرل ایجوکیشن نصاب کے ڈائرکٹر رہے، ۱۹۶۸ء میں پنڈت جواہر لال نہرو نے انھیں آل انڈیا ریڈیو میں اپنا ادبی مشیر نامزد کیا اور پھر ۱۹۶۷ء میں ڈاکٹر ذاکر حسین کی مدد سے انھوں نے ''اسلام اینڈ دی ماڈرن ایج'' کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا اور اسی نام سے انگریزی میں ایک سہ ماہی رسالہ نکالا، اردو میں اسلام اور عصرِ جدید کے نام سے ایک سہ ماہی رسالہ وہ نکالتے رہے، انہیں پدم بھوشن کا خطاب بھی دیا گیا، ان کی علمی دلچسپیاں متنوع تھیں، انھوں نے کئی ادبی تخلیقات کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا، وہ ادب پاروں کی روح کو اردو میں منتقل کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے، وہ ایک فلسفی تھے اور سماجی مفکر بھی تھے اور ان کے مضامین میں بہت زیادہ شگفتگی اور دل کشی کا عنصر موجود ہے، مزاح اور طنز وظرافت سے متعلق بھی ان کی تحریریں ہیں، جسے پڑھ کر تبسم نمودار ہوتا ہے، انھوں نے تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں، ڈاکٹر عابد حسین کا شمار ان ادیبوں میں ہوتا ہے جنھوں نے اردو نثر کو فروغ دیا۔

مسعود حسن رضوی ادیب

(۱۸۹۳ء۔۱۹۷۵ء)

مسعود حسن رضوی ادیبؔ ایک سر برآوردہ ادیب اور نقاد اور محقق ہیں، انھوں نے لکھنؤ کی تہذیب اور یہاں کے ادبی کارناموں کو متعارف کرانے میں اہم رول ادا کیا، میر انیسؔ کے فن کی تفہیم وتحقیق سے متعلق ان کی کئی کتابیں ہیں جیسے روحِ انیسؔ، شاہ کارِ انیسؔ اور رزم نامہ انیسؔ، وہ لکھنؤ یونیورسٹی میں استاد رہے اور یونیورسٹی کی مجلسِ عاملہ کے رکن بھی رہے، ۱۹۷۰ء میں انہیں پدم شری کا خطاب ملا، ان کی کتابوں کی تعداد تیس سے اوپر بتائی جاتی ہے جن میں بعض کتابوں کی حیثیت تحقیق کی ہے اور بعض کتابیں تنقید سے متعلق ہیں، ان کی مشہور کتابوں میں ''مجالسِ رنگین''، ''فیضِ نیر'' اور ''متفرقاتِ غالبؔ'' اور ''آبِ حیات کا تنقیدی مطالعہ'' اور ''تنقیدِ کلامِ غالبؔ'' اور ''نگارشاتِ ادیبؔ'' اور ''سلطانِ عالم واجد علی شاہ'' ہیں، ان کی وہ کتاب جو اردو زبان وادب اور شاعری کا پاکیزہ

ذوق پیدا کرنے میں بہت معاون ہے اور جو بہت زیادہ مقبول بھی ہوئی ہے وہ ان کی کتاب ''ہماری شاعری'' ہے، انھوں نے اردو شاعری پر لگائے الزامات کا جواب بہت شائستہ اور مہذب انداز میں دیا ہے، مسعود حسن رضوی کا شمار نہ صرف بلند پایہ نقاد میں ہوتا ہے بلکہ انھوں نے اردو شاعری کی خوبیوں اور محاسن پر بہت اچھے انداز میں روشنی ڈالی ہے، الطاف حسین حالؔی نے مقدمۂ شعروشاعری میں اردو شاعری پر جو تنقیدیں کی تھیں ان کا جواب لیکن بہت ہی شائستگی کے ساتھ مسعود حسن رضوی نے دیا ہے، حالؔی نے کہا تھا کہ اردو شاعری گل وبلبل کی شاعری ہے، مسعود حسن رضوی نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ گل وبلبل دراصل زندگی کی علامتیں ہیں جن کے وسیلے سے غزل گوشعراء نے دریا کو کوزہ میں بند کرنے کی کوشش کی ہے۔

آغا حشر کاشمیری (۱۸۷۶۔۱۹۳۵ء)

آغا حشر کاشمیری ڈرامہ نگاری میں اردو کے شکسپیر کہلاتے ہیں۔ اردو ڈرامہ کی نشاونما اور ترقی میں ان کی کوششوں کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا، ان کا آبائی وطن کشمیر تھا، ان کے خاندان کے دو بزرگ کشمیری شال کی تجارت کرتے تھے اور اس سلسلے میں بنارس آئے تھے جہاں انھوں نے مستقل سکونت اختیار کی تھی، بنارس ہی میں آغا حشر کاشمیری کی ولادت ہوئی اور یہیں انھوں نے اردو، فارسی اور عربی کی تعلیم حاصل کی، اور یہیں انھوں نے راج نارائن ہائی اسکول میں داخلہ لیا، اور یہیں انھوں نے اپنی شاعری کا آغاز کیا اور حشؔر تخلص اختیار کیا، بمبئی کی ایک تھیٹر کی کمپنی جب بنارس آئی تو اس نے ہنگامہ برپا کردیا، حشؔر نے اس کمپنی کے ڈرامے دیکھے تو ان کے اندر سویا ہوا ڈرامہ نگار بیدار ہوگیا، انھوں نے سب سے پہلے ''آفتابِ محبت'' کے نام سے ایک ڈرامہ لکھا، پھر وہ بمبئی چلے گئے اور یہاں ان کے تعلقات ایک ناٹک منڈلی کمپنی کے مالک سے ہوئی، کمپنی کا مالک ان کی فی البدیہہ شعرگوئی کی صلاحیت سے متاثر ہوا، اور انہیں اپنے یہاں ملازم رکھ لیا، یہاں انھوں نے کئی ڈرامے لکھے، جیسے مریدِ شک، اسیرِ حرص، یہ ڈرامے بہت مقبول ہوئے، اور انھوں نے پھر ''جرمِ وفا'' اور ''باپ کا قاتل'' اور ''ترکی کی حور'' کے نام سے ڈرامے لکھے، ان ڈراموں نے مقبولیت کی بلندیوں کو چھولیا، انھوں نے حشر فلمس کے نام سے اپنی کمپنی بھی قائم کی اور ''خوبصورت بلا'' اور ''یہودی لڑکی'' اور ''صیدِ ہوس'' کے نام سے ڈرامے لکھے، یہ سارے ڈرامے بہت مقبول ہوئے، ان ڈراموں میں برجستہ گوئی، فقرے بازی، خطابت اور شاعری کا جادو جگایا گیا تھا، بہت سے مکالموں میں سجع اور قافیہ کا التزام تھا، اس لیے کہ قدیم ڈراموں کا یہی اسلوب ہوا کرتا تھا، بعد میں انھوں نے اپنے ڈراموں میں زمانے کے لحاظ سے تبدیلیاں کیں لیکن اس کے ساتھ ہی عوام کے معیار اور ذوق کو پیشِ نظر رکھا گیا، آغا حشر کاشمیری نے اپنے

ڈراموں میں ہمیشہ ادبیت قائم رکھنے کی کوشش کی، ان کے ادبی اعتبار سے مشہور ڈراموں میں ’’سیتا بن باس‘‘ اور ’’رستم وسہراب‘‘ مشہور ڈرامے ہیں، ادبی حیثیت سے آغا حشر کاشمیری نے ڈرامہ کو دل کشی عطا کی ہے، اور بقول آل احمد سرور آغا حشر قدیم اور جدید ڈرامہ کے درمیان ایک کڑی کی حیثیت رکھتے ہیں۔

امتیاز علی تاجؔ (۱۹۰۰۔۱۹۷۰ء)

اردو ڈرامہ کی تاریخ میں مشہور ڈرامہ ’’انارکلی‘‘ کے تخلیق کار امتیاز علی تاجؔ کا نام ہمیشہ زندہ وتابندہ رہے گا، اردو میں ڈرامہ نگاری نے اتنی ترقی نہیں کی جتنی دوسری زبانوں کے ڈراموں نے کی، اس کے بہت سے اسباب بتائے جاتے ہیں، ایک تو یہ کہ اس فن کو مذہبی اعتبار سے ثقہ اور معتبر نہیں سمجھا گیا، اس لیے مذہبی ذہن کے لوگ اس سے گریزاں رہے، بہرحال اردو ڈرامہ نگاری میں انارکلی کی حیثیت ایک سنگِ میل کی ہے اور اس کے ڈرامہ نگار امتیاز علی تاجؔ کی تعلیم وتربیت لاہور میں ہوئی ، انھوں نے گورنمنٹ کالج لاہور سے ۱۹۲۲ء میں بی اے کی ڈگری لی، وہ تہذیبِ نسواں کے نام سے ایک رسالہ بھی نکالتے رہے جسے ان کے والد نے شروع کیا تھا، پھر امتیاز علی تاجؔ نے ۱۹۱۸ء میں ’’کہکشاں‘‘ کے نام سے رسالہ جاری کیا اور جب ان کا ڈرامہ انارکلی ۱۹۲۲ء میں منصۂ شہود پر آیا تو اسے غیر معمولی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی، انہیں ستارۂ امتیاز سے پاکستانی حکومت نے نوازا، ان کے اور بھی کئی ڈرامے ہیں جیسے حلیم قلب، اور صید وصیاد، ورجینا اور الوّ کی زبان وغیرہ، وہ ایک کثیر التصانیف نثر نگار تھے، اور ان کی کہانیوں کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں جیسے اسکول کی کہانیاں، بونوں کی کہانیاں، بیربل کی کہانیاں، خزانوں کی کہانیاں، خانہ بدوشوں کی کہانیاں، سانپوں کی کہانیاں، جنوں کی کہانیاں، کنجوسوں کی کہانیاں اور ہیبت ناک افسانے، اور چچا چھکن وغیرہ، یہ سب ان کی نثری یادگاریں ہیں، اور چچا چھکن اردو کے مزاحیہ ادب کا ایک قابلِ قدر نقش ہے۔

ان کے ڈراموں، افسانوں اور کہانیوں میں جو شہرت انارکلی کو ملی وہ کسی اور کتاب کو نہیں مل سکی ، اس ڈرامہ میں انھوں نے مغل حکمرانوں کی حرم سرا، خواجہ سرا، کنیزوں اور بیگمات کی شاندار مرقع کشی کی ہے، ان سب کے آداب وانداز، طرزِ گفتگو، شہنشاہ کے رعب وجلال کو انھوں نے مجسم کردیا ہے، اور ہر کردار کی زبان اور گفتگو کا فرق ملحوظ رکھا ہے، جس سے جذبات کی عکاسی بھی ہوتی ہے اور کردار کا فرق بھی ظاہر ہوتا ہے، ڈرامہ کے آغاز سے انجام تک تجسس اور تذبذب کی فضا برقرار رہتی ہے، مغلوں کے قلعے، باغات کی تصویر کشی کی گئی ہے، انارکلی کے برجستہ مکالمے ڈرامہ نگار کی قوتِ اظہار اور فنی ذکاوت کے مظہر ہیں۔

پروفیسر محمد مجیب (۱۹۰۲۔۱۹۸۵ء)

محمد مجیب ان باکمال شخصیتوں میں سے ہیں جنھوں نے بیسویں صدی میں دانشوری کی روایات کو استحکام عطا کیا، وہ لکھنؤ میں پیدا ہوئے، دہرادون کے ایک پرائیویٹ اسکول میں ثانوی تعلیم حاصل کی، اعلی تعلیم کے لیے آکسفورڈ بھیج دئے گیے، یہاں انھوں نے لاطینی اور فرانسیسی زبانیں سیکھیں، جامعہ ملیہ اسلامیہ کی ترقی میں انھوں نے ڈاکٹر ذاکر حسین، شفیق الرحمٰن قدوائی اور ڈاکٹر عابد حسین صاحب کے ساتھ حصہ لیا، جامعہ ملیہ میں تاریخ کے استاد کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا، اور جب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب جامعہ ملیہ سے علی گڑھ چلے گئے تو پروفیسر محمد مجیب نے شیخ الجامعہ یعنی وائس چانسلر کی ذمہ داری سنبھالی، انھوں نے جامعہ میں کئی شعبے قائم کیے اور بہت سی کتابیں لکھیں جو ان کی گہری بصیرت اور تاریخ دانی اور دانشوری اور ادبی ذوق پر دلالت کرتی ہیں، انھوں نے انگریزی میں انڈین مسلم کے نام سے قابلِ قدر کتاب لکھی، اردو میں ان کی بہت کتابیں ہیں، ان کی ایک کتاب ’’دنیا کی تاریخ‘‘ ان کے عمیق نظر، وسیع مطالعہ، فلسفیانہ بصیرت اور شگفتہ اسلوب پر دلالت کرتی ہے، ان کی دوسری کتابوں میں تاریخ ہندوستان کی تمہید، تاریخ فلسفہ سیاسیات، روسی ادب ،تاریخ تمدن ہند (قدیم)، اردو کلام کا انتخاب اہم ہیں۔

پروفیسر محمد مجیب ادیب اور مؤرخ ہونے کے ساتھ ساتھ بہت اچھے ڈرامہ نگار بھی تھے، ’’کھیتی‘‘ ان کا پہلا ڈرامہ ہے، ’’خانہ جنگی‘‘ اور ’’حبہ خاتون‘‘ ان کے دوسرے ڈرامے ہیں، ان کا ایک ڈرامہ ’’آزمائش‘‘ کے نام سے ہے، ’’ہیروئن کی تلاش‘‘ کے نام سے ان کا ایک اور ڈرامہ ہے، ان کے تمام ڈراموں میں مقصدیت کا عنصر بہت نمایاں رہتا ہے اور جس کی وجہ سے مکالمے طویل بھی ہو جاتے ہیں، بحیثیت مجموعی ان کا اسلوب سادہ ، پراثر اور عام فہم ہے، ان کے پیشِ نظر ہمیشہ ایک مقصد ہوتا ہے اور وہ مقصد انشا پردازی کی رنگینی کے درمیان بھی صاف نظر آتا ہے۔

قاضی عبد الودود (۱۸۹۷۔۱۹۸۴ء)

قاضی عبد الودود نے اردو ادب میں تحقیق وتدوین کی روایت کو فروغ دیا اور تحقیق کے آداب کا سلیقہ سکھایا، اور اس میدان میں حق گوئی و بے باکی کا درس دیا، حق اور باطل، سیاہ وسپید کے درمیان حدِ فاصل قائم کرنے کا ہنر آشکار کیا، قاضی عبدالودود ایک اصول پرست اور سخت گیر محقق ہیں اور راست گفتاری اور حقیقت پسندی سے سمجھوتہ کرنے کے قائل نہیں ہیں، گیان چند جین نے انہیں ’’بت شکن‘‘ محقق کے نام سے یاد کیا ہے، انھوں نے اردو ادب کے بہت سے ایسے بتوں کو توڑا جن کی عظمت اور برگزیدگی مسلمہ تھی، اور ان کا ’’فرمایا ہوا‘‘ ’’مستند‘‘ تصور کیا جاتا تھا، قاضی عبدالودود نے عربی فارسی کی تعلیم اپنے وطن

بہار میں حاصل کی ، پھر وہ علی گڑھ گیے ،علی گڑھ کے کالج میں داخلہ لیا ، یہاں لاطینی ، جرمن اور فرانسیسی زبانیں سکھائی جاتی تھیں ،۱۹۲۰ء میں امتیاز کے ساتھ بی اے کی ڈگری لی ،اوراس کے بعداعلی تعلیم کے لیے انگلستان چلے گیے اور بیرسٹری کا امتحان پاس کیا ، مارچ ۱۹۲۹ء میں پٹنہ واپس ہوگیے اورعلم وادب کی خدمت میں مصروف ہوئے ، انہوں نے انگریزی اورفرانسیسی ادب کا بھی گہرائی کے ساتھ مطالعہ کیا ، انھیں تاریخ اور قانون سے بھی دل چسپی تھی ،انھوں نے اپنی تمام توانائی بحث وتحقیق میں صرف کی ، ان کی مشہور تصانیف میں ''تذکرۂ شعراء''،''دیوان جوشؔ'' اور''قاطع برہان''اہم ہیں،ان کے تحقیقی مضامین کی تعداد دوسو سے اوپر ہے،ان کی اہم تحریروں میں ''غالب کا فرضی استاذ''''میرتقی میرؔ حیات وشاعری''اور''عبدالحق بحثیت محقق'' اور''شادؔ کی کہانی شادؔ کی زبانی'' وغیرہ شمار کی جاتی ہیں ، ان کو میرتقی میرؔ اور انشاؔ اور غالبؔ اور مصحفیؔ سے غیر معمولی لگاؤ تھا ، انھوں نے مسعود حسن رضوی کی ''دیوانِ فائز'' پر محققانہ تبصرہ لکھا ، انھوں نے اپنی کتاب ''عیارستان'' میں خواجہ احمد فاروقی کی متعدد اغلاط کی نشاندہی کی ،انھوں نے خواجہ احمد فاروقی کے مآخذ کا بڑی سختی کے ساتھ محاسبہ کیا اور اس نتیجے پر پہونچے کہ خواجہ احمد فاروقی نے جن تصانیف کے حوالے دئے ہیں وہ ان کی نظر سے نہیں گزری تھیں، قاضی عبدالودود تحقیق میں دوستی ، ذاتی تعلقات اور مراسم کو کوئی اہمیت نہیں دیتے ، انھوں نے بابائے اردو عبدالحق کو بھی اپنی تنقید کا نشانہ بنایااور عبدالحق کی مرتب کردہ ''ذکرِ میرؔ''''انتخاب کلامِ میرؔ''''نکاتِ شعراء'' ''گلشن ہند'' کا تحقیقی نقطۂ نظر سے جائزہ لیا ، ذکرِ میرؔ پر قاضی عبدالودود کا سب سے اہم اعتراض یہ ہے کہ عبدالحق نے تدوین کے دوران اس کتاب کے صرف ایک نسخہ پر تکیہ کیا اور دوسرے نسخوں سے استفادہ نہیں کیا ، عبدالحق پر قاضی عبدالودود کے تحقیقی محاکمات کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ غیر محتاط محقق ہیں اور فارسی نثر سمجھنے میں اکثر سہو کا شکار ہوگیے ہیں، اور یہ بھی لکھا ہے کہ اس کا بھی احساس ہوتا ہے کہ عدیم الفرصتی کی وجہ سے انھوں نے دوسروں سے بھی کام کروائے ہیں ، کتاب عیارستان میں بھی عبد الودود نے خواجہ احمد فاروقی کی کتاب ''اشتر وشوزن'' پر سخت تنقید کی ہے، اور قاضی عبدالودود نے یہ بھی لکھا ہے کہ مرتب نے سن کتابت کو تاریخِ تصنیف سمجھا ہے اور یہ بھی لکھ دیا ہے کہ مصنف نے جو غلطیاں کی تھیں انہیں خواجہ احمد فاروقی نے جوں کا توں چھاپ دیا ہے۔

قاضی عبد الودود نے غالبؔ پر کوئی پینتیس مضامین سپرد قلم کیے ہیں ، اور غالبؔ بحثیت محقق میں انھوں نے ''قاطع برہان'' کے سلسلے کے مباحث پر روشنی ڈالی ہے اوران مباحث میں غلطیوں اور تسامحات کا جائزہ لیا ہے۔

ادبی تذکروں کے سلسلے میں قاضی عبدالودود کی معلومات بہت وسیع اور غیر معمولی ہیں، اردو کے بہت کم مصنفین اس معاملہ میں ان کا مقابلہ کرسکتے ہیں، قاضی عبد الودود ایک بلند پایہ محقق ہیں، انھوں نے تحقیق کو ایک فن بنا کر پیش کیا اور ان کی تحریروں کی وجہ سے بہت سے مصنفین تحقیق کی طرف متوجہ ہوئے اور انھوں نے محققین کو حزم واحتیاط کا درس دیا، ان کا نظریہ ہے کہ محقق کو عبارت آرائی اور رنگین بیانی اور تشبیہات واستعارات کے استعمال سے گریز کرنا چاہئے اور تحقیق کی زبان دو اور دو چار کی طرح واضح ہونا چاہئے، خود وہ اپنے اصول پر کاربند رہے، انھوں نے اردو زبان کے طلباء اور اساتذہ کو آئینِ تحقیق سکھائے اور اردو تحقیق کو علمی وقار سے آشنا کیا۔

مختار الدین احمد آرزوؔ (۱۹۲۴-۲۰۰۹)

مختار الدین احمد عربی زبان کے عالم، قدیم اردو متون کے ماہر اور شمالی ہند کی پہلی اردو ''کربل کتھا'' کے مرتب کی حیثیت سے مشہور ہیں، یہ تصنیف اردو ادب میں ان کا نام ہمیشہ تابندہ رکھے گی، مختار الدین کا شمار اردو کے ان محققین میں ہوتا ہے جنہیں مخطوطہ شناسی کے آئین وآداب پر کامل دست رس حاصل ہے، انھوں نے ابتدائی تعلیم اپنے وطن پٹنہ میں حاصل کی، ان کے والد مولانا ظفر الدین قادری ایک بڑے عالم تھے اور کئی کتابوں کے مصنف تھے، انھوں نے مدرسہ شمس الہدیٰ میں فاضل کا امتحان پاس کیا، اس کے بعد انھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور عربی میں ایم اے کیا اور ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے انھیں علی گڑھ کی لائبریری کے شعبۂ مخطوطات کا سربراہ بنادیا، وہ صبح سے دوپہر تک لائبریری میں کام کرتے اور پھر دوپہر سے شام تک شعبۂ عربی میں بحیثیت رسرچ اسکالر مصروفِ تحقیق ومطالعہ ہوتے، پی ایچ ڈی میں ان کے نگراں مشہور محقق عبدالعزیز میمن تھے، ۱۹۵۳ء میں شعبۂ عربی میں لکچرر مقرر ہوئے، بعد میں وہ آکسفورڈ بھی گیے اور جرمنی اور فرانس اور دوسرے ملکوں میں اردو ادب سے متعلق مواد حاصل کرتے رہے، انھیں تحقیق سے بڑا شغف تھا، انھوں نے مختلف تحقیقی موضوعات پر مضامین سپردِ قلم کیے اور تدوین سے بھی دل چسپی لی جس کے معیاری نمونے ''تذکرۂ شعراءِ فرخ آباد''، ''سیرِ دہلی'' ''کربل کتھا''، ''گلشنِ ہند''، ''تذکرۂ حیدری'' اور ''تذکرۂ آزردہ'' ہیں، انھوں نے مخطوطات کی وضاحتی فہرستیں بھی تیار کیں جن سے تحقیق کرنے والوں کو پتہ چلتا ہے کہ کونسا مخطوطہ کہاں دست یاب ہوسکتا ہے، اس طرح کے کاموں میں ''فہرست مخطوطات احسن گلشن''، ''فہرست مخطوطات ونوادر کتب خانہ مسلم یونیورسٹی'' زیادہ اہم ہیں۔

انھوں نے شروع میں شاعری بھی کی لیکن قاضی عبدالودود کے فیضِ صحبت سے ان کو تحقیق سے دل چسپی پیدا ہوئی تو انھوں نے شاعری ترک کردی اور تحقیق وتدوین کی

طرف متوجہ ہو گیے ، اردو تحقیق میں مختار الدین احمد کی ایک انفرادیت یہ بھی ہے کہ انھوں نے بہت سے ایسے متون دریافت کیے جن کی دریافت کا سہرا بھی انہیں کے سر ہے، انھوں نے راجہ رام موہن رائے کا ایک خط بھی ڈھونڈ نکالا ، یہ خط انھوں نے یورپ کے ذخیروں سے حاصل کیا تھا ، انھوں نے لندن، فرانس اور جرمنی کے نایاب ذخیروں سے استفادہ کیا اور ان چھپے ہوئے خزانوں سے گوہرِ آب دار حاصل کیے ، ان کی کتاب کربل کتھا ان کو اردو کے معتبر محققین میں شمار کیے جانے کی سفارش کرتی ہے، انھوں نے جس خلوص، توجہ اور انہماک کے ساتھ کربل کتھا کی تدوین کی ہے وہ نوجوان محققین اور تازہ واردانِ بساطِ تحقیق کے لیے قابلِ تقلید ہے۔ ان کے پاس ان کے نام ادباء اور شعراء کے بہت سے خطوط ہیں اور انہوں نے جن ادباء اور شعراء اور اہل علم کو خطوط لکھے تھے ان کی نقل بھی ان کے پاس محفوظ ہے۔ یہ علمی خزانہ ابھی تک زیورِ طبع سے آراستہ نہیں ہوسکا ہے۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے ورثاء کو چاہئے کہ ان کو شائع کریں۔

مولوی عبد الحق (۱۸۷۰ء۔۱۳۸۱ھ)

اردو کے سلسلے میں مولوی عبد الحق نے جو گرانقدر خدمات انجام دی ہیں وہ ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی ، انھیں بابائے اردو کا خطاب دیا گیا ہے، جوش ملیح آبادی انھیں دیوانۂ اردو کہا کرتے تھے، انھوں نے اپنی زندگی اردو زبان وادب کے لیے وقف کردی تھی ، ان کی پیدائش ہاپور کے قریب سرادھا نامی گاؤں میں ضلع میرٹھ اتر پردیش میں ہوئی تھی ، پھر وہ پنجاب چلے آئے ، پھر وہ حصولِ علم کے لیے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ گیے ، سرسید، حالی، شبلی جیسے اکابرِ قوم کی تربیت میں ان کی شخصیت پروان چڑھی، پھر وہ حیدر آباد آئے اور ایک رسالہ ''افسر'' کی ادارت ان کے سپرد کی گئی، اور مدرسہ آصفیہ میں وہ مدرس ہو گیے ، اردو لغت کی تیاری کے لیے ماہانہ ایک ہزار روپیہ انھیں ملتا رہا ، جو انیس سو تیس (۱۹۳۰) سے انیس سو چالیس (۱۹۴۰) تک جاری رہا ، جامعہ عثمانیہ میں دار الترجمہ کا قیام عمل میں آیا تو وہ اس کے ناظم مقرر کیے گیے ، اور جب اورنگ آباد کالج قائم ہوا تو اس کے پرنسپل مقرر ہوئے ، اور جامعہ عثمانیہ میں اردو کے پروفیسر بھی رہے، اور انجمن ترقی اردو کا دفتر جب دہلی منتقل ہو گیا تو وہ بھی دہلی چلے گیے ، ۱۹۴۸ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے ان کو ڈاکٹریٹ کی اعزازی سند دی، ۱۹۴۸ء میں وہ پاکستان چلے گیے اور وہاں انجمن ترقی اردو پاکستان کی بناء ڈالی اور اردو کالج بھی قائم کیا۔

بابائے اردو عبد الحق نے بعض اہم تذکرے مرتب کیے اور ان پر مفید مقدمات سپرد قلم کیے، ''نکات الشعراء''، ''تذکرہ ریختہ گویان''، ''مخزن نکات''، ''چمنستان''، ''شعراء''، ''عقد ثریا''، ''تذکرۂ ہندی''، ''ریاض الفصحاء''، ''مخزن الشعراء'' کو انھوں نے اردو داں

طبقہ سے روشناس کروایا کہ ان کی تاریخی اور ادبی اہمیت واضح ہوگئی،عبدالحق کا شماران محققین میں ہوتا ہے جنھوں نے دکنی ادب کے سرمایہ میں اپنی تحقیق سے قابل قدر اضافے کیے، انھوں نے وجہی کی ''سب رس'' کو مرتب کرکے اس کے مقدمہ میں اس گرانقدر ادبی تخلیق کا اسلوبیاتی مطالعہ بھی کیا،اوراس کے ماخذوں سے بھی بحث کی،عبدالحق نے پہلی باراردو دنیا کونثر کے قدیم نمونے کی طرف متوجہ کیا،انشاء کی کہانی ''ایرانی کیتلی''ادب میں ایک اہم اضافہ ہے،عبدالحق نے ایشیاٹک سوسائٹی کے قدیم کتب کے ذخیرہ سے اسے حاصل کیا تھا،۱۹۳۳ء میں عبد الحق نے ایک اہم کتاب لکھی جس کا نام تھا''اردو کی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا کام''،ان کی ایک اور کتاب ''نصرتی'' ہے،نصرتی دکن کا نہایت ممتاز اور قدآور شاعر تھا،مصنف نے اپنی کتاب میں شاعر کے حالات پر روشنی ڈالی ہے۔

نیازؔ فتحپوری (وفات۱۹۶۶ء)

نیازؔ فتحپوری ایک شاعر، ایک بصیرت مند نقاد اور ایک اچھے انشاء پرداز اور صحافی تھے، انھوں نے پانچ دہائیوں تک علم وادب کی جو گرانقدر خدمت انجام دی وہ ناقابلِ فراموش ہے،ان کی ابتدائی تعلیم مدرسہ اسلامیہ فتحپور میں ہوئی، بعد میں انھوں نے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں بھی داخلہ لیا اور وہ اس لیے کہ نیازؔ فتحپوری کے والد دارالعلوم ندوہ میں مطبخ کے ذمہ دار مقرر ہوگیے تھے،لیکن ندوہ میں ان کی تعلیم کا زمانہ مختصر رہا،انھوں نے الہ آباد میں ملازمت کی اور پھر ظفر علی خان نے ''زمیندار'' میں کام کرنے کی دعوت دی اور وہ لاہور چلے آئے، پھر وہ زمیندار سے بھی الگ ہوگیے، حکیم اجمل خان نے ایک چھوٹا سا انگریزی اسکول قائم کیا تو نیازؔ اس کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوگیے، پھر انھوں نے اس سے بھی استعفا دے دیا اور بھوپال آگیے جہاں ان کا گیارہ برس تک قیام رہا، ''گہوارہ تمدن''، ''صحابیات''، ''مصطفیٰ کمال پاشا''، ''تاریخ اسلام ابتدا سے حملۂ تیمور تک'' قیام بھوپال کے زمانہ کی تصانیف ہیں، ۱۹۲۷ء میں پھر لکھنؤ منتقل ہوگیے۔اس کے بعد انھوں نے رسالہ ''نگار'' جاری کیا، اور چوالیس برس تک نگارؔ پابندی کے ساتھ شائع ہوتا رہا، نیازؔ کی صحافتی اور ادبی خدمات کے صلہ میں حکومت ہند نے انھیں پدم بھوشن کے خطاب سے سرفراز کیا، جولائی ۱۹۶۲ء میں نیازؔ ہندوستان سے ہجرت کرکے پاکستان چلے گیے وہاں انھیں اردو ترقی بورڈ اور اردو لغت کا کام سونپا گیا، نیازؔ فتحپوری نے ''عرض نغمہ'' کے نام سے ٹائیگور کی گیتانجلی کا ترجمہ کیا، نیازؔ کے افسانے رومانیت، جمالیاتی ذوق اور تہذیبی حسیت کے آئینہ دار ہیں اوران میں سماجی مسائل کا عکس نظر آتا ہے، نیازؔ کے دوطویل افسانے ''شہاب کی سرگزشت'' اور ''شاعر کا انجام'' نے بڑی شہرت اور مقبولیت حاصل کی، اس کے علاوہ ''حسن کی عیاریاں'' چوبیس کہانیوں پر مشتمل ہے اور ''مختاراتِ نیازؔ''

میں دس افسانے ہیں جو انگریزی فکشن سے ماخوذ ہیں ، ''چند دن بمبئی میں'' نیاؔز فتحپوری کی انشاء پردازی کا بہترین نمونہ ہے، نیاؔز فتحپوری مناظرِ قدرت کے دل دادہ ہیں، ان کے علاوہ نیاز کی تصانیف ''انتقادیات'' اور ''ما لہ وما علیہ'' سے ان کے تنقیدی رویہ کا پتہ چلتا ہے، ''کلامِ مؤمن پر ایک طائرانہ نظر'' نیاؔز کا ایک اہم تنقیدی مضمون ہے، انھوں نے داغؔ، ریاضؔ خیرآبادی، نظیؔر اکبرآبادی، حسرتؔ موہانی اور اقبالؔ پر بھی تنقیدی مضامین سپرد قلم کیے ہیں، وہ نگار کے ۴۴ تک سال تک اڈیٹر رہے اور چالیس سال سے زیادہ عرصہ تک انھوں نے اردو طبقہ کے ادبی ذوق کی تکمیل کی اور تشنگانِ علم کی پیاس بجھائی۔

مجنوںؔ گورکھپوری (۱۹۰۴۔۱۹۸۸ء)

مجنوںؔ گورکھپوری کی شخصیت ہمہ گیر اور ہمہ جہت تھی وہ افسانہ نگار بھی تھے اور نقاد بھی تھے، ان کا اصل نام احمد صدیق تھا اور وہ ضلع بستی کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے تھے، عربی فارسی کی تعلیم کے بعد انھوں نے انگریزی میں ایم اے کیا، ان کے اکثر افسانوں کا انجام المیہ ہوتا ہے ان کی کہانیوں میں عورت خلوص ووفا کا پیکر بن کر ہمارے سامنے آتی ہے ، مجنوںؔ گورکھپوری ملازمت سے علحدگی اختیار کرنے کے بعد پاکستان چلے گیے تھے ، انھوں نے بحیثیت نقاد بھی بہت کام کیا ہے، اور ان کی نثر پر اثر ، سادہ بے ساختہ اور رواں ہے ، ان کے اندر جذبات نگاری کا سلیقہ موجود ہے اور وہ اپنے کرداروں کو مؤثر انداز میں پیش کرتے ہیں، انھوں نے ''زیدی کا حشر'' کے نام سے ایک دل چسپ اور مؤثر ناولٹ بھی لکھا تھا، مجنوںؔ کے افسانے زندگی کو رازِ الفت کے طور پر پیش کرتے ہیں ، اور اپنے افسانوں میں انھوں نے مذہب وملت کو محبت کے راستہ میں حائل نہیں ہونے دیا، ان کے مشہور افسانوں میں ''خواب وخیال''، ''بے گانہ''، ''شکستہ بے صدا''، ''سمن پوش''، ''تم میرے ہو''، اور ''من در چہ خیالم وفلک در چہ خیال'' کا شمار ہوتا ہے، ان کے افسانوں میں دل کشی ہوتی ہے اور قاری ان میں محو ہو جاتا ہے۔

اردو تنقید میں مجنوںؔ گورکھپوری کا مقام بلند ہے اور انھوں نے نئے رجحانات ونظریات کا اس میدان میں تعارف کرایا ہے، ان کا شمار نئی تنقید کے معماروں میں ہوتا ہے، تنقید سے متعلق ان کے بہت سے مضامین ہیں جیسے ''ادب اور زندگی''، ''مبادیاتِ تنقید''، ''زندگی اور ادب کا بحران''، ''ادب اور ترقی''، ''نظیر اکبرآبادی''، ''حالیؔ کا مرتبہ اردو ادب میں'' اور ''نیا ادب کیا ہے'' مجنوںؔ گورکھپوری کے اہم تنقیدی مضامین ہیں، ان کی کتابیں بھی ہیں، جیسے ''ادب اور زندگی''، ''تنقیدی حاشیے''، ''نقوش وافکار''، ''اقبال'' اور ''نکاتِ مجنوںؔ''، ان کتابوں سے مجنوںؔ کے تنقیدی افکار اور خیالات کا تعارف ہوتا ہے، کہیں کہیں ان کا تنقیدی اسلوب بہت تاثراتی ہو جاتا ہے، جیسے وہ لکھتے

ہیں ’’اردو شاعری بھی اپنا خدار کھتی ہے اور وہ میر کہلاتا ہے ‘‘، ظاہر ہے کہ اس طرح کے تبصروں سے مضمون نگار کی عقیدت کا اظہار ہوتا ہے لیکن شاعر کی شخصیت پر صحیح روشنی نہیں پڑتی ہے، ایک جگہ وہ لکھتے ہیں ’’تنقید بھی ادب کی ایک صنف ہے اور لکھنے والے کے ذاتی ذوق اور اس کے جذبات سے اس کو الگ نہیں کیا جا سکتا‘‘، بعد میں مجنوں گورکھپوری نے حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر بھی اختیار کیا اور کارل مارکس کے افکار کو بھی اپنایا، لیکن اسی کے ساتھ ساتھ وہ کسی ادب پارے میں گھلاوٹ، آہنگ، فنی حسن، دل کشی اور جمالیاتی رچاؤ کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کرتے ہیں، ایک جگہ وہ رقم طراز ہیں کہ ’’ادب قوموں کے عروج وزوال کا آئینہ ہوتا ہے‘‘ ان کا یہ نقطہ نظر مشہور انگریزی نقاد میتھیو آرنلڈ کے فکر کا انعکاس ہے، کیونکہ اس نے ادب کو زندگی کی تنقید سے تعبیر کیا تھا، انھوں نے آرنلڈ کے نظریات کی تائید کی ہے، انھوں نے ادب کو معاشرتی محرکات کا آفریدہ بھی بتایا ہے، انھوں نے نظیر اکبرآبادی کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے روحِ عصر کی اہمیت اجاگر کی ہے، اور وہ ایک جگہ رقم طراز ہیں کہ ’’اب بھوک اور پیاس اور دوسری انسانی حقیقتوں کو ادب اور شاعری میں وہی جگہ دی جائیگی جو پہلے حسن وعشق کو دی جاتی تھی‘‘، مجنوں گورکھپوری کا اسلوبِ نگارش دل چسپ، شگفتہ، رواں اور دل آویز ہے، اور قاری اس کی جاذبیت کو محسوس کیے بغیر نہیں رہتا، انھوں نے اقبالؔ کے شاہین پر تنقید کی ہے کہ اس سے جارحیت اور سفا کی اور قوت کے استعمال کا درس ملتا ہے۔

کلیم الدین احمد (۱۹۰۸۔۱۹۸۳ء)

اردو ادب میں کلیم الدین احمد کو مغربی ادب وتنقید کے وکیل کی حیثیت سے دیکھا جاتا ہے، مغربی ادب اور تنقید ان کے نزدیک معیار ہے، اور جو ادب یا تنقید اس معیار پر پوری نہ اترتی ہو وہ پست، حقیر اور کم مایہ ہے، کلیم الدین احمد کی ابتدائی تعلیم پٹنہ میں ہوئی اور پٹنہ یونیورسٹی سے انھوں نے ۱۹۳۰ میں ایم اے کی ڈگری لی، پھر وہ انگلستان گیے اور کیمبرج یونیورسٹی سے اپنی تعلیم مکمل کی، وطن واپس آئے تو پٹنہ یونیورسٹی میں پروفیسر بنادئے گیے، اور بعد میں شعبۂ انگریزی کے صدر بھی مقرر ہوئے، پھر پٹنہ کالج کے پرنسپل ہوئے اور بھاگل پور یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہے، حکومت نے انھیں پدم شری کے خطاب سے بھی نوازا۔

کلیم الدین احمد نے انگریزی ادب کے اصولوں کو جوں کا توں اردو شعراء اور ادیبوں پر منطبق کرنے کی کوشش کی، اور یہ حقیقت فراموش کردی کہ ہر ملک کے ادب کا ایک مخصوص مزاج اور اس کی تہذیبی اور ادبی روایت ہوتی ہے، تنقید کے موضوع پر ان کی کتاب ’’اردو شاعری پر ایک نظر‘‘ ایک دھماکہ کی حیثیت رکھتی ہے، ان کی نظر میں

اردو شاعری اور اردو ادب بے حیثیت اور بے قیمت ہے، قصیدہ کو انھوں نے تملق اور خوشامد کا نمونہ قرار دیا، مثنوی کو معقولیت سے بعید کہا، غزل کو نیم وحشی صنفِ سخن کہا، اور اردو تنقید کے بارے میں کہا کہ اس کا وجود فرضی ہے، یہ اقلیدس کا حسابی نقطہ ہے یا معشوق کی موہوم کمر۔ کلیم الدین احمد نے ترقی پسند رجحانات پر بھی تنقید کی ہے اور یہ لکھا ہے کہ ''ادب کو سماج کا پروردہ قرار دینا بے وقوفی ہے'' اور ترقی پسند ادب پر انھوں نے یہ تبصرہ کیا ہے کہ ''ادب کا تعلق دماغ سے ہے پیٹ سے نہیں ہے''، شاعری کے بارے میں کہتے ہیں کہ ''تمام علوم وفنون کی طرح یہ بھی دماغی تحریکات کا نتیجہ ہے''، کلیم الدین احمد کا مطالعہ وسیع ہے اور ان کا تنقیدی شعور گہرا ہے لیکن ان کا لب ولہجہ بہت درشت ہے، ان کا اندازِ تنقید منفی ہے، چنانچہ ان کا نظریہ یہ ہے کہ اردو کے شعراء میں تنظیم وترتیب کا سلیقہ ناپید ہے، وہ قومی اور ملی شاعری کو شاعری کے رتبہ سے کم تر تصور کرتے ہیں، انھوں نے اردو کے ادباء اور شعراء اور اہلِ نقد کے بارے میں جو تبصرے کیے ہیں وہ بہت منفی نوعیت کے ہیں اور جارحانہ ہیں، جیسے آل احمد سرور کے بارے میں انھوں نے یہ لکھا کہ ''وہ دسترخوان کی مکھی ہیں شہد کی مکھی نہیں''، فراق گورکھپوری کی تنقیدوں کے بارے میں لکھا کہ ''وہ پہلے شاعر تھے اور اب نقاد بھی ہیں اور نئے روپ میں نظر آتے ہیں، عشق کرنا سکھاتے ہیں، شاید وہ دلال ہیں'' احتشام حسین جیسے نقاد کے بارے میں وہ یوں رقم طراز ہیں ''جب احتشام حسین اس طرز میں لکھتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ہاتھی خوش فعلیاں کررہا ہے''، کلیم الدین احمد ہر شاعر کے لیے یہ ضروری تصور کرتے ہیں کہ وہ مغربی ادب کا مطالعہ کرے اور جو فن کار مغرب سے استفادہ نہیں کرتا اس کی تخلیق کو وہ کم مایہ، کم عیار، سبک، ناقص اور سطحی قرار دیتے ہیں، نظیر اکبرآبادی کے بارے میں وہ رقم طراز ہیں کہ وہ ''مغربی ادب سے واقف نہ ہوسکے، اسی لیے ان کا مطمحِ نظر بلند نہ تھا''، انھوں نے ترقی پسند ادب پر بھی بہت زیادہ تنقیدیں کیں، اوران کی تنقیدوں کی وجہ سے ترقی پسندوں کو بھی ہوش کے ناخن لینے پڑے، ان کا دعوی یہ ہے کہ سنسنی خیزی ان کی سرشت میں نہیں ہے اور انھوں نے جو کچھ لکھا ہے سوچ سمجھ کر کے لکھا ہے۔

آل احمد سرور بھی کلیم الدین احمد کی خیال آفریں تنقید کو پسند کرتے ہیں اور دقتِ نظر کے قائل ہیں لیکن ان کا اعتراض یہ ہے کہ ''ان کی تنقید اور بلند ہوتی اگر وہ اپنے قدیم سرمایہ سے اس قدر بیزار نہ ہوتے'' موجودہ شکل میں کلیم الدین احمد کی تنقید گلستاں میں کانٹوں کی تلاش بن گئی ہے۔

اختر اورینوی (۱۹۱۰۔۱۹۷۰)

اختر اورینوی بہار کے ضلع گیا میں پیدا ہوئے، کاکو قصبہ ان کا وطن تھا، وہ افسانہ نگار بھی تھے، ڈرامہ نویس

بھی تھے، ناول نگار بھی تھے اور شاعر بھی تھے، اور ایک اچھے نقاد بھی تھے، ان کے تنقیدی مضامین اور ان کے افسانوں کی وجہ سے ان کی ادبی کاوشیں یاد رکھی جائیں گی، اردو فارسی اور انگریزی کی تعلیم گھر پر حاصل کی، پھر وہ پٹنہ یونیورسٹی کے طالب علم رہے، ۱۹۳۸ میں پٹنہ کالج میں اردو کے لکچرر مقرر ہوئے، ان کے افسانوں کے کئی مجموعے ہیں، ''منظر و پس منظر''، ''کلیاں اور کانٹے'' اور ''انارکلی'' اور ''بھول بھلیاں'' وغیرہ، ان کا ناول ''حسرت تعمیر'' ۱۹۶۱ میں فروغ اردو لکھنؤ سے شائع ہوا، ان کا شعری مجموعہ ''انجمن آرزو'' کے نام سے شائع ہوا، ان کی کتاب ''بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقاء'' ان کے تنقیدی مضامین کے مجموعے ''قدرو نظر''، ''تحقیق و جدید تنقید''، ''کسوٹی''، ''مطالعۂ اقبال''، ''مطالعۂ نظیر''، ''تنقید جدید'' اور ''سراج و منہاج'' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں، وہ اپنے ایک مضمون ''میرا نظریہ فن'' میں لکھتے ہیں کہ وہ تخلیق میں سماجی میلانات اور ماحول کی معروضیت کی اہمیت کو محسوس کرتے ہیں لیکن اس خیال کے حامل ہیں کہ ادب میں انفرادیت اور قوتِ تخلیق و تعمیر کی اہمیت نسبتاً زیادہ ہے، ان کا کہنا ہے کہ ایک ادیب اختراعی اور جمالیاتی مطالبات سے ہم آہنگ ہو کر ہی تخلیق کے منصب پر فائز ہو سکتا ہے، اختر اورینوی کا مطالعہ بہت وسیع ہے، انھوں نے سائنس، عمرانیات، مذہب، فلسفہ اور فنون لطیفہ کا گہرا مطالعہ کیا تھا، وہ ذوقِ حسن کو عطیہ فطرت تصور کرتے ہیں اور آرٹ اور مذہب کا چشمہ فیض وجدان کو قرار دیتے ہیں، وہ تنقید کو ایک ذوقی چیز تصور کرتے ہیں، انھوں نے اپنے ادبی تصورات کی اپنے مضامین میں وضاحت کی ہے، اختر اورینوی بحیثیت نقاد بڑی اہمیت کے حامل اس لیے ہیں کہ ان کی تحریروں میں بڑا توازن ہے، ایک ایسے دور میں جب ترقی پسندی فیشن بن گئی تھی وہ افراط و تفریط کے شکار نہیں ہوئے اور نعرہ بازی اور پروپگنڈہ کو ادب کا نعم البدل قرار دینے سے انھوں نے انکار کیا، اختر اورینوی اخلاقی اقدار کی اہمیت کے قائل ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ عریاں نگاری ادب پر ایک داغ ہے، اختر اورینوی کے اسلوب میں حسن کاری اور سحر آفرینی پائی جاتی ہے، اختر اورینوی کے تنقیدی مضامین پڑھ کر اہل ادب جو رائے قائم کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ اختر اورینوی تہذیبی ماحول اور جمالیاتی حسن دونوں کے قائل ہیں اور اچھے ادب کو ان دونوں کی کارفرمائی کا نتیجہ تصور کرتے ہیں۔

خواجہ احمد فاروقی (۱۹۱۷۔۱۹۸۵)

خواجہ احمد فاروقی نے کم لکھا ہے لیکن جو کچھ لکھا ہے بہت غور و فکر اور توجہ کے ساتھ لکھا ہے، ان کا وطن مراد آباد تھا، ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی، پھر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے وابستہ ہو گئے اور حلیم مسلم کالج کانپور میں اردو کے استاد کی حیثیت سے کام کیا، پھر وہ دہلی کالج آ گیے اور یہاں انھوں نے اردو کا باقاعدہ شعبہ قائم کیا، اور پھر دہلی

یونیورسٹی میں شعبۂ اردو میں صدر رہے ، ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ''کلاسیکی ادب'' کے نام سے ۱۹۵۳ میں شائع ہو چکا ہے ، اس کے بعد ''میر تقی میر ۔ حیات و شاعری'' کے نام سے کتاب لکھی جس پر انھیں ساہتیہ اکیڈمی انعام ملا، ''ذوق وجستجو'' اور ''چراغِ رہ گزر'' ان کے تنقیدی مضامین کے مجموعے ہیں ، انھوں نے اپنی کتاب ''یادِ یارِ مہرباں'' میں بزرگوں اور دوستوں کے سوانحی حالات قلم بند کیے ہیں، ''اسلامک کلچر'' حیدرآباد ''فکر ونظر'' علی گڑھ کے اڈیٹر کی حیثیت سے بھی کام کیا ہے۔

میر تقی میر پر خواجہ احمد فاروقی نے بڑی توجہ اور محنت سے کام کیا ہے، اور عہدِ میر کے تاریخی حالات قلم بند کیے ہیں ، اور اس عہد کے تہذیبی پس منظر کو بھی اجاگر کیا ہے، ان کے تنقیدی مضامین اکثر تاثراتی تنقید معلوم ہوتے ہیں، مثال کے طور پر میر تقی میر کے بارے میں وہ لکھتے ہیں ''ان کا ہر آنسو ایک شعر ہے اور ہر مصرع ایک خون کی بوند، ان کا دل مضغۂ گوشت نہیں سوزِ عشق کا آتش کدہ ہے'' فارسی ادب کے مطالعہ نے خواجہ احمد فاروقی کے کلاسیکی ذوق کو نکھار دیا ہے۔

احتشام حسین (۱۹۱۲۔۱۹۷۲ء)

احتشام حسین ایک ایسے بلند مرتبہ دانشور اور نقاد تھے جو زندگی بھر ادبی حسن کی دریافت اور حسن کمال کی جستجو میں ایک دیر یاب منزل کی طرف رواں دواں رہے ، احتشام حسین شاعر بھی تھے اور افسانہ نویس بھی، انھوں نے سفر نامے لکھے اور ترجمہ کے فن پر عبور کا ثبوت دیا ، علم لسانیات میں مفید اضافے بھی کیے لیکن ان کو اصلا ایک بڑے تنقید نگار کی حیثیت سے یاد رکھا جائیگا، ان کا وطن اعظم گڑھ تھا ، ہائی اسکول انھوں نے اپنے وطن میں پاس کیا ، پھر الہ آباد یونیورسٹی سے بی اے کی ڈگری لی، ۱۹۳۶ میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی ، پھر وہ لکھنؤ یونیورسٹی میں لکچرر ہوئے ، پھر ریڈر ہوئے ، پھر بعد میں الہ آباد یونیورسٹی میں پروفیسر منتخب ہوئے اور صدر شعبۂ اردو کی حیثیت سے خدمات انجام دیں، انھوں نے ادب کی دنیا میں پہلے ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے قدم رکھا اور ۱۹۴۴ میں ''ویرانے'' کے نام سے ان کے افسانوں کا مجموعہ شائع ہوا، اس کے بعد ان کے تنقیدی مضامین پے در پے شائع ہوئے ''تنقیدی جائزے''، ''روایت اور بغاوت''، ''ادب اور سماج''، ''تنقید اور عملی تنقید''، ''ذوقِ ادب اور شعور''، ''عکس اور آئینے'' اور ''اعتبارِ نظر'' ان کی گرانقدر تصانیف ہیں ، انھوں نے اردو تنقید کو ایک نئے افق سے روشناس کیا ، ''ساحل اور سمندر'' ان کا دل چسپ اور معلوماتی سفر نامہ ہے ، انھوں نے ایک انگریزی کتاب کا ترجمہ ''ہندوستانی لسانیات کا خاکہ'' کے نام سے شائع کیا اور علمِ لسانیات میں اضافہ کیا، انھوں نے کلامِ جوش کا انتخاب بھی شائع کیا اور ''آبِ حیات'' کی تلخیص بھی کی ، ''اندھیری راتیں''

احتشام حسین کے ڈراموں کا مجموعہ ہے ، اور ’’سلک گہر‘‘ نظموں کا انتخاب ہے ، انھوں نے اردو ادب کی تنقیدی تاریخ بھی لکھی ہے، ایک نقاد کی حیثیت سے وہ اردو ادب میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں ، انھوں نے اردو تنقید کو وزن اور وقار عطا کیا ، احتشام حسین کے تنقیدی تصورات میں مارکسی خیالات کی گونج سنائی دیتی ہے،لیکن انھوں نے قدیم ادبی سرمایہ سے محبت اور اس کے احترام میں کوئی کمی نہیں کی ہے ، وہ جمالیاتی اور تاثراتی تنقید کے قائل نہیں ہیں، احتشام حسین کی تنقیدیں ایک طرف سماجی علوم سے مربوط ہیں تو دوسری طرف اپنے دور کی جمالیات سے بھی ان کا رشتہ استوار نظر آتا ہے، احتشام حسین کا اندازِ نظر اور اسلوبِ بیان علمی رنگ میں ڈوبا ہوا نظر آتا ہے اس لیے کبھی کبھی بعض اہلِ ادب ان کی تحریروں میں خشکی اور بے کیفی محسوس کرتے ہیں ، دراصل احتشام حسین مصنوعی نگینوں سے آب وتاب حاصل نہیں کرتے ہیں اور مرصع سازی اور مینا کاری سے گریز کرتے ہیں ، وہ مارکسی تنقید سے وابستہ رہے ،لیکن ان کی تحریریں ان کی ذہنی بالیدگی اور رچے ہوئے تنقیدی شعور کی آئینہ دار ہیں۔

آل احمد سرور (۱۹۲۱۔۲۰۰۲)

آل احمد سرور نے تنقید کے علاوہ ایک دانشور کی حیثیت سے اور ایک صاحبِ اسلوب ادیب کی حیثیت سے اور ایک دیدہ ور مصنف کی حیثیت سے اپنا مقام بنالیا ہے اور اردو زبان وادب کو ان کی تحریروں سے بصیرت اور گہرائی و گیرائی ملی ہے، انھوں نے تنقید کے نظریہ کو بھی حرارت اور توانائی عطا کی ہے، حسن کی تلاش اور ہر رنگ میں بہار کے اثبات نے ان کی تحریروں کو دل کشی اور جاذبیت عطا کی ہے، انھوں نے حسن سے مضبوط پیمانِ وفا باندھا ہے، اور یہی ان کی تحریر کی سب سے بڑی خصوصیت ہے، انھوں نے اپنی ادبیت، شگفتگی اور سحر آفرینی سے اردو کے نثر کے حسن میں اضافہ کیا ہے، بلاشبہ وہ ان ممتاز مصنفین میں ہیں جن کے اسلوبِ بیان اور اندازِ نگارش پر اردو نثر ناز کرسکتی ہے، بدایوں ان کا وطن تھا ، پیدائش پیلی بھیت میں ہوئی تھی ، بدایوں کے بعد گونڈا میں انھوں نے تعلیم حاصل کی اور پھر آگرہ کے کالج میں داخلہ لیا، پھر وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی چلے گیے ، وہاں سے انھوں نے انگریزی میں اور اردو میں ایم اے کا امتحان پاس کیا اور ہیں شعبۂ اردو میں لکچرر مقرر ہوئے ، پھر لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں ریڈر مقرر ہوئے ، پھر دوبارہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی آئے اور پروفیسر کے عہدے پر فائز ہوئے ، وہ شکاگو میں اردو کے وزیٹنگ پروفیسر ہوئے ، وہ ادب میں کسی مخصوص نظریہ کے پابند نہیں رہے لیکن وہ ہر تحریک کے صالح اور صحت مند رجحانات کو اخذ کرنے کے قائل رہے، ان کی دانست میں ادب کی پہلی اور آخری شرط ادبیت ہے ، وہ کہتے ہیں کہ میں ادب میں پہلے ادبیت دیکھتا ہوں بعد میں کچھ اور۔ اور وہ یہ بھی کہتے

ہیں کہ میں ادب کا مقصد نہ ذہنی عیاشی سمجھتا ہوں اور نہ اشتراکیت کا پرچار، ان کا کہنا ہے کہ جدید دور میں فن کو تہذیبی تنقید کا فرض انجام دینا چاہئے، ان کا خیال ہے کہ اگر نقاد صرف اخلاقی پہلوؤں کو دیکھتا ہے یا صرف افکار پر توجہ کرتا ہے اور فن کے جادو اور حسن کا راز معلوم نہیں کرتا ہے تو وہ اپنے منصب کو نہیں پہچانتا ہے ، ان کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے قدیم اور جدید تصورات کے تصادم کے اس دور میں ادبی توازن کو برقرار رکھا ہے، وہ ان لوگوں کے بھی مخالف ہیں جو ماضی سے رشتہ منقطع کرنا چاہتے ہیں، وہ یہ کہتے ہیں کہ اگر ادب سے اس کا ماضی چھین لیا جائے تو وہ ایک کٹی ہوئی پتنگ کی طرح بے سمتی کا شکار ہوجائیگا، آل احمد سرور ترقی پسندی کے عروج کے زمانہ میں بھی زیادہ ترقی پسند نہ ہوسکے، انھوں نے اپنی انفرادیت کو برقرار رکھا، وہ اپنی تنقید کے تیشہ سے بت شکنی سے زیادہ بت تراشی کا کام لیتے ہیں، وہ تنقید سے ادب کو سڈول، خوبصورت، متناسب اور جاذبِ نظر بنانا چاہتے ہیں، انھیں اس کا ایقان ہے کہ اچھی تنقید ادب کی طرف مائل کرتی ہے اور وہ خود تخلیقی ہوتی ہے، ان کے نزدیک بڑی تنقید تخلیقی ادب سے کسی طرح کم تر نہیں ہوتی، بلکہ خود تخلیق ہوجاتی ہے۔

آل احمد سرور نے مغربی ادب اور مغربی تنقید کا گہرا مطالعہ کیا لیکن مغربی تنقید کو اردو ادب پر مسلط نہیں ہونے دیا، انھوں نے اردو تنقید کو نیا ذہن، نئی فکر، نئی جہت اور نیا اسلوب عطا کیا ہے، ان کی بہت ساری تصنیفات ہیں ''تنقیدی اشارے'' ''تنقید کیا ہے'' ''نئے اور پرانے چراغ'' ''ادب اور نظریہ'' ''عکسِ غالبؔ'' ''عرفانِ غالبؔ'' ''جدیدیت اور ادب'' ''تنقید کے بنیادی مسائل'' اور ''مسرت سے بصیرت تک''، ان کتابوں سے ان کے تنقیدی مسلک اور ادبی نظریہ کے بارے میں رائے قائم کی جاسکتی ہے، انھوں نے شاعری بھی کی ہے، میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ کے ساتھ انگریزی شعراء سے بھی متاثر ہوئے ہیں، بحیثیت مجموعی آل احمد سرور ایک صاحب طرز ادیب ہیں۔ عبارتوں کو دل فریبی اور رعنائی عطا کرنے میں بہت کم ہم عصر ان کی سطح کو پہنچ سکتے ہیں۔

رشید احمد صدیقی (۱۸۹۴۔۱۹۷۷ء)

رشید احمد صدیقی اس عہد کے صاحبِ اسلوب ادیب اور بذلہ سنج مزاح نگار ہیں، ان کی تحریروں میں سنجیدہ مزاح اور گلکاری اور سحر آفرینی پائی جاتی ہے، ان کی ابتدائی تعلیم جون پور میں ہوئی، علی گڑھ یونیورسٹی سے انھوں نے ایم اے کیا اور وہیں اردو کے لکچرر، ریڈر اور پروفیسر ہوئے ، ان کی ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر ان کو پدم شری کا خطاب بھی عطا کیا گیا، ان کی تصانیف میں ''طنزیات و مضحکات'' ''مضامینِ رشید'' ''خنداں'' ''گنج ہائے گراں مایہ'' ''آشفتہ بیانی میری'' ''جدید غزل'' ''ذاکر صاحب''

’’سہیل کی سرگزشت‘‘ اور’’ہم نفسانِ رفتہ‘‘ اہم اور مشہور کتابیں ہیں، وہ علی گڑھ میگزین کے اڈیٹر رہے، نیادور اور ادیب اور معارف میں ان کے مضامین شائع ہوتے رہے۔

رشید احمد صدیقی اردو کے ایک بلند پایہ ادیب، مزاح نگار اور خاکہ نگار ہیں، خاکہ نگاری میں ان کی دو کتابیں’’ہم نفسانِ رفتہ‘‘ اور’’گنج ہائے گراں مایہ‘‘ ہیں، جس شخص کو رشید احمد صدیقی کا اسلوب دیکھنا ہو اور مشہور شخصیات کے بارے میں ان کے نقطہ نظر کو جاننا ہو اس کو یہ دونوں کتابیں خاص طور پر پڑھنی چاہئے، ان کی ادبیت اور معنی خیزی اور فلسفہ آمیزی اور مزاح انگیزی سے لبریز اسلوب دیکھنا ہو تو اسے ان کی دوسری کتابوں کے ساتھ ان دو کتابوں کا بھی مطالعہ کرنا چاہئے، علی گڑھ سے ان کو والہانہ لگاؤ ہے، اس تعلیمی ادارہ سے ان کی شیفتگی کا اظہار قدم قدم پر ہوتا ہے اور ان کی کتاب’’ذاکر صاحب‘‘ سے ذاکر حسین صاحب کی شخصیت اور ان کی خدمات کے ساتھ ساتھ ان سے رشید احمد صدیقی کی عقیدت پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

رشید احمد صدیقی کی تحریروں کی شگفتگی، خندہ آفرینی اور تبسم ریزی قاری کو مسحور کردیتی ہے، ان کی مزاح نگاری بہت سنجیدہ قسم کی ہے، انھوں نے پھکڑ پن اور بے اعتدالی کو کہیں راہ نہیں دی ہے، مزاح نگاری میں وضع داری اور شائستگی کا جلوہ اگر کسی کو دیکھنا ہو تو اسے رشید احمد صدیقی کی تحریریں پڑھنی چاہئے، رشید احمد صدیقی کے جملے بڑے تراشیدہ ہوتے ہیں، انھیں فقرے تراشنے اور ذو معنی عبارت لکھنے میں بڑی مہارت حاصل ہے، وہ اپنی تحریروں میں بلاغت کی ایک خاص صنعت کا استعمال کرتے ہیں یعنی ایک ہی جگہ ایسے دو لفظوں کا استعمال جو ایک حرف سے شروع ہوتے ہیں اور صوتی موسیقیت رکھتے ہیں، مجموعی طور پر ان کی تمام تحریریں بہت پر لطف اور انبساط پرور ہوتی ہیں، گنج ہائے گراں مایہ اور ہم نفسانِ رفتہ مرقع کشی کا نہایت اعلی نمونہ ہیں، گنج ہائے گراں مایہ میں انھوں نے اس’’کندن‘‘ کی مرقع کشی ہے جو یونیورسٹی میں گھنٹہ بجاتا تھا، بڑی شخصیتوں کا خاکہ لکھنا آسان ہوتا ہے لیکن’’کندن‘‘ کا خاکہ لکھنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں، رشید احمد صدیقی اپنی تحریروں میں مذہب واخلاق کے طرفدار نظر آتے ہیں اور مذہبی شخصیتوں اور علماء کے بارے میں ان کا تاثر عام طور پر مؤثر اور دل فریب ہوتا ہے۔

عبد الحلیم شرؔر (۱۸۶۰۔۱۹۲۶ء)

عبد الحلیم شرؔر اردو کے ان چند ادیبوں اور ناول نگاروں میں ہیں جنہوں نے ادب کے مختلف میدانوں میں اپنی بصیرت اور دیدہ وری کی یادگاریں چھوڑیں۔ ناول نگاری، مضمون نویسی، ڈرامہ نگاری اور شعر گوئی میں شرؔر نے اپنی انفرادیت کے ایسے نقوش ابھارے ہیں جو ان کے نام

کو اردو ادب کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ و تابندہ رکھیں گے، ان کی ولادت لکھنؤ میں ہوئی، یہاں انھوں نے عربی فارسی کی تعلیم حاصل کی، انھوں نے اپنے علمی کام کا آغاز اس طرح کیا کہ واجد علی شاہ کے نام بیگمات عالیات جو خطوط بھیجا کرتی تھیں ان کی ترتیب و تدوین کا کام انھوں نے شروع کیا اور پھر ادبی رنگینی کے ساتھ شہزادوں کی صحبت اور شب و روز کی محفلوں نے زبان کی اصلاح میں مدد کی، شررؔ نے دہلی میں بھی تعلیم حاصل کی اور انھوں نے ۱۸۸۷ میں رسالہ ''دلگداز'' جاری کیا اور اس میں ان کے بعض ناول قسط وار بھی شائع ہوتے رہے، حیدرآباد میں بھی عبدالحلیم شررؔ کا قیام رہا لیکن وہ دوبارہ لکھنؤ آگیے اور پھر یہاں سے ان کی ادبی تخلیقات کا باقاعدہ آغاز ہوتا ہے، ان ناولوں میں ''دل چسپ''، ''دل کش''، ''ملک العزیز ورجینا''، ''حسن انجلینا''، ''منصور موہنا''، ''قیس ولبنیٰ''، ''یوسف و نجمی''، ''ایام عرب''، ''فردوس بریں''، ''مقدس نازنین''، ''بدر النساء کی مصیبت''، ''شوقین ملکہ''، ''فتح اندلس''، ''ماہ ملک''، ''فلپانا''، ''بغداد''، ''رومۃ الکبریٰ''، ''حسن کا ڈاکو''، ''الفانسو''، ''خوفناک محبت''، ''فاتح مفتوح''، ''بابک خرمی''، ''جویائے حق''، ''لعبت چین''، ''عزیزہ مصر''، ''طاہرہ''، ''نیکی کا پھل''، ''مینا بازار''، ''شہزادہء حبش'' شامل ہیں۔ عبدالحلیم شررؔ نے اردو میں تاریخی ناول نگاری کو ایک مستقل فن کی حیثیت سے برتا اور اردو ناول نگاری کو ایک نئی جہت سے آشنا کیا۔

ہمیں یہ نقطۂ پیش نظر رکھنا چاہئے کہ تاریخی ناول تاریخ نہیں ہوتے ہیں، بلکہ ناول نگار ایک خاص عہد کے حالات اور تہذیبی اور سیاسی واردات کے تناظر میں کرداروں کو ابھارتا ہے اور واقعات کی ایک جھلک دکھاتا ہے اور ماضی کے جھروکے کھول دیتا ہے، اردو ادب کے آئینہ میں تاریخ کی جھلک دیکھنے اور دکھانے والوں میں سب سے پہلے عبدالحلیم شررؔ کا نام لیا جاسکتا ہے، تاریخی ناول نگاری کے تقاضوں سے عہدہ برآں ہونا مشکل ہے، تاریخی ناول تاریخ نہیں ہوتے لیکن قاری ان میں تاریخی صداقتیں تلاش کرلیتا ہے، شررؔ کے تاریخی ناولوں کی تعداد ۳۴ ہے، انھوں نے طبع زاد ناولوں کے علاوہ ناولوں کے ترجمے بھی کیئے ہیں۔ ''منصور موہنا'' میں محمود غزنوی کے کردار پر روشنی ڈالی گئی ہے، اور ''فلورا فلورنڈا'' میں پس منظر اسپین کی سرزمین ہے جب وہاں عبدالرحمٰن ثانی کی حکومت تھی، عیسائیوں اور مسلمانوں کے اندازِ فکر اور معتقدات کا ٹکراؤ اس ناول کی اساس بن گیا ہے، ''ایام عرب'' دو حصوں پر مشتمل ہے اور اس کے رومانی قصہ کا آغاز بازار عکاظ سے ہوتا ہے، ایام عرب کا موضوع طلوع اسلام سے قبل کا عربی ماحول ہے، عربوں کے طور طریق، جہالت، مہمان نوازی اور ان کے طرزِ رہائش اور اندازِ فکر کی اس ناول میں بڑی مؤثر عکاسی کی گئی ہے، ''فردوس

بریں‘‘ عبدالحلیم شرؔر کا ایک اچھا اور فنی اعتبار سے قابلِ توجہ ناول ہے، اس کے قصہ کا تعلق فرقۂ باطنیہ سے ہے، اس ناول کے ہیرو ’’حسن‘‘ اور اس کی ہیروئن ’’زمرد‘‘ ہے، فرقۂ باطنیہ کا بانی حسن بن صباح تھا، فردوس بریں میں شرؔر نے فرقۂ باطنیہ کی گمراہیوں کا پردہ چاک کیا ہے، یہ ناول خاصا دل چسپ ہے، عبدالحلیم شرؔر کے معاشرتی ناول بھی ہیں جیسے ’’دل چسپ‘‘ اور ’’دل کش‘‘ اور ’’بدرالنساء کی مصیبت‘‘ ان ناولوں میں شرؔر نے اپنے عہد کی معاشرتی ناہمواریوں کو اجاگر کیا ہے، ان ناولوں میں عبدالحلیم شرؔر ایک مصلح کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں، شرؔر کے مضامین کا مجموعہ آٹھ جلدوں میں شائع ہوا ہے، شرؔر کے اسلوب کا سب سے نمایاں پہلوان کی عبارت آرائی اور پرلطف اور شگفتہ نثر ہے، ان کے مضامین ’’بزمِ قدرت‘‘ ’’چاندنی رات‘‘ ’’غرورِ حسن‘‘ ’’خیالِ یار‘‘ ’’بوئے وفا‘‘ ’’تیرنظر‘‘ اور ’’صبحِ چمن‘‘ شرؔر کی رنگین اور شگفتہ انشا پردازی کے حسین نمونے ہیں، شرؔر نے آخری دور میں سوانح عمریاں اور تاریخ کے موضوع پر کتابیں بھی لکھی ہیں جن میں ’’خواجہ معین الدین چشتی‘‘ ’’تاریخ یہود‘‘ ’’ابوالحسن‘‘ اور ’’تاریخ خلافت‘‘ بہت مشہور و مقبول ہیں۔

عزیز احمد (۱۹۱۴۔۱۹۷۸ء)

ہندوستان میں بیسویں صدی کی پانچویں دہائی تک اردو ناول کی تاریخ میں جو سب سے اہم اور معتبر نام ہے وہ عزیز احمد کا ہے، عزیز احمد ایک مفکر، ایک دانشور اور ایک ادیب تھے، افکار کی دنیا میں جو تبدیلیاں ہو رہی تھیں اور جو تحریکیں اٹھی تھیں ان سے وہ پورے طور پر باخبر تھے۔ اقبالؔ پر سینکڑوں کتابیں لکھی گئی ہیں، ان کتابوں میں جو چند نام بہت زیادہ اہم سمجھے جاتے ہیں ان میں عزیز احمد کی کتاب ’’اقبالؔ اور نئی تشکیل‘‘ ہے، فکشن کی دنیا میں ایک بہت بڑے دانشور کی حیثیت سے عزیز احمد نے قدم رکھا، ان کی ادبی صلاحیتیں ان کے ناولوں میں بروئے کار آئی ہیں، ان کے اندر کردار نگاری، فضا آفرینی اور جزئیات کی پیش کشی کا اچھا سلیقہ ہے، ان کا اصل وطن تو بارہ بنکی اتر پردیش تھا لیکن ان کے والد بشیر احمد وکالت سے وابستہ ہوگئے تھے اور سرزمینِ حیدرآباد کو انھوں نے اپنا وطن بنالیا تھا، عزیز احمد نے تعلیم کی ابتدائی منزلیں حیدرآباد میں طے کیں، عثمانیہ یونیورسٹی سے انھوں نے بی اے کیا، پھر وہ اعلی تعلیم کے لیے لندن روانہ ہوگیے۔ وہ ۱۹۳۸ میں لندن سے حیدرآباد واپس آئے اور عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبۂ انگریزی میں ریڈر مقرر ہوئے، تقسیمِ ملک کے بعد عزیز احمد پاکستان چلے گیے اور وہاں مختلف عہدوں پر فائز رہے۔

عزیز احمد نے ایک کامیاب ناول نگار کی حیثیت سے ادب میں اپنی جگہ بنائی ہے۔ انھوں نے اردو ناول کی سمت اور رفتار کو نئے امکانات سے روشناس کیا ہے، عزیز

احمد کے ناول ''ایسی بلندی ایسی پستی''، ''گریز''، ''آگ'' اور ''شبنم'' نے اردو فکشن میں ان کا تشخص قائم کیا ہے، عزیز احمد نے روایتی انداز سے انحراف کیا ہے اور مواد، ہیئت اور اسلوب میں جدت اور ندرت کو اختیار کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا مطالعہ اور ان کا مشاہدہ دونوں وسیع تھا، انھوں نے اپنے ناولوں میں حقیقی زندگی کی ترجمانی کی کوشش کی ہے، انکی عصری حسیت ان کے ناولوں اور افسانوں میں تہذیبی شعور کے ساتھ موجود ہے، ان کا ایک ناول ''ہوس'' ہے جو پردہ کی مخالفت میں لکھا گیا ہے لیکن اس طرح سے کہ فن پر مقصدیت کو غالب آنے نہیں دیا گیا ہے، ہوس عزیز احمد کا شاہکار ناول تو نہیں ہے لیکن اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ناول ترقی کی منزلیں طے کررہا ہے، ہوس اور ان کے دوسرے ناول ''مرمر'' اور ''خون'' کے بارے میں عبدالحق نے لکھا ہے کہ یہ اس دور کے ناول ہیں جب اعصاب پر جنسی ہیجان غالب رہتا ہے، عزیز احمد میں جذبات نگاری کا سلیقہ موجود ہے، ان کا ایک ناول ''گریز'' بھی ہے، بعض نقادوں کو اس ناول میں شعور کے رو کی جھلک نظر آتی ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک میں ''گریز'' کو سجاد ظہیر کی ''لندن کی ایک رات'' کی ارتقائی شکل سے تعبیر کیا ہے، لیکن وہ عزیز احمد کی عریاں نگاری کو پسند نہیں کرتے، لیکن اس ناول سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ عزیز احمد کو ناول کی ٹکنیک پر عبور حاصل ہے، عزیز احمد کا ناول ''آگ'' کشمیری زندگی کی عکاسی کرتا ہے، اور اس ناول میں ہندوستانی سیاست کے نشیب وفراز اور اس کی اہم تبدیلیوں کی بھی نشاندہی کی گئی ہے، آگ میں تین نسلوں کی کہانی بیان کی گئی ہے، عزیز احمد کے ناول ''ایسی بلندی ایسی پستی'' کا پس منظر حیدرآباد ہے جہاں عزیز احمد کی زندگی کا قابل لحاظ حصہ گزرا، حیدرآباد کی تہذیب اور اس کے خدوخال کو ناول نگار نے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ ناول کے پس منظر میں ابھارا ہے، اس ناول کا کینوس بہت وسیع ہے اور اس میں کرداروں کی کثرت بھی ہے۔

عزیز احمد کے ناولٹ میں ''تیری دل بری کا بھرم''، ''جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں'' قابل ذکر ہیں۔ ''بیکار دن اور بیکار راتیں'' ''اور رقص نا تمام'' ان کے افسانوں کے مجموعے ہیں، حیدرآبادی طرز تکلم اور بول چال کے نمونے عزیز احمد کی تحریروں میں محفوظ ہوگیے ہیں، ''تصورِ شیخ''، ''باغبان''، ''کٹھ پتلیاں'' اور ''رومۃ الکبری کی ایک شام'' کا عزیز احمد کے اچھے افسانوں میں شمار ہوتا ہے، عزیز احمد شاعر بھی ہیں، نقاد بھی ہیں، ان کی ایک کتاب ''ترقی پسند ادب'' ہے، پھر ان کی ایک دوسری کتاب ''اقبالؔ اور پاکستانی ادب'' ہے، ان کی کتاب ''اقبالؔ نئی تشکیل'' کا شمار اقبالیات کے موضوع پر اہم کتابوں میں کیا جاتا ہے۔

قرۃ العین حیدر (۱۹۲۸ـ۱۹۹۹ء)

اردو کی منفرد مصنفہ، دانشور، افسانہ نگار، ناول نگار قرۃ العین حیدر نے اپنے تجربات اور اسلوب کی ندرت اور تازہ کاری کے وسیلے سے اپنی شناخت قائم کی ہے، قرۃ العین حیدر کی پیدائش علی گڑھ میں ہوئی، ان کے والد سجاد حیدر یلدرم اردو کے مشہور انشائیہ نگار اور افسانہ نویس تھے، ''کارجہاں دراز ہے'' میں قرۃ العین حیدر نے اپنے آباء و اجداد اور خاندان کا تفصیل سے ذکر کیا ہے، قرۃ العین حیدر کی والدہ نذر سجاد حیدر رسالہ ''تہذیب نسواں'' اور ''پھول'' وغیرہ میں مضامین لکھا کرتی تھیں، قرۃ العین حیدر نے دہرہ دون میں کانونٹ اسکول میں تعلیم حاصل کی، پھر لکھنؤ کے کالج میں داخلہ لیا اور ۱۹۴۷ میں انگریزی میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی، تقسیم ملک کے بعد وہ کچھ عرصہ پاکستان میں مقیم رہیں، لیکن بیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں ہندوستان واپس آگئیں۔ انھوں نے انگریزی صحافت میں کام کیا اور السٹریٹڈ ویکلی کی مدیرہ معاون رہیں، وہ شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں بھی ویزیٹنگ پروفیسر رہیں، ان کے افسانوں کے متعدد مجموعے شائع ہو چکے ہیں ''ستاروں سے آگے''، ''شیشے کے گھر''، ''پت جھڑ کی آواز'' ''روشنی کی رفتار''، ''جگنوؤں کی دنیا'' ان کے افسانوں کے مجموعے ہیں۔ ناولوں میں ''میرے بھی صنم خانے''، ''سفینۂ غمِ دل''، ''آگ کا دریا''، ''آخر شب کے ہم سفر''، ''دل ربا''، ''سیتا ہرن''، ''چائے کے باغ'' مشہور ہیں، ان کے رپورتاژ میں ''ستمبر کا چاند''، ''کوہ دماں''، ''گل گشت'' اور ''خضر سوچتا ہے'' معروف ہیں، تراجم میں ''ہمیں چراغ ہمیں پروانے''، ''آدمی کا مقدر''، ''کلیسا میں قتل''، ''تلاش'' وغیرہ قابلِ قدر ادبی کاوشیں ہیں، انھوں نے بچوں کے لیے بھی کتابیں تصنیف کیں۔

''میرے بھی صنم خانے'' سے لیکر ''چاندنی بیگم'' اور ''گردشِ رنگِ چمن'' میں وقت کی گریزاں نوعیت کا احساس ہوتا ہے، موجودہ دور میں وقت کی لہروں اور انسانی حافظہ کی نقش گری کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کے رجحان نے تقویت پائی ہے، اردو فکشن میں اس کی سب سے اچھی مثال ''آگ کا دریا'' ہے جس میں شعور کی رو کی کارفرمائی سے ایک نئی ٹکنیک معرضِ وجود میں آئی ہے، قرۃ العین حیدر نے وقت اور انسانی وجود کی اس میں شرکت زندگی کے انجام یعنی موت اور نسلِ انسانی کی مسلسل بقا کو آگ کا دریا کا مرکز اور محور بنایا ہے، قرۃ العین حیدر کے ناولوں میں ندی نے وقت کے استعارہ کی حیثیت حاصل کرلی ہے، وقت کا فلسفہ قرۃ العین حیدر کا مرغوب اور پسندیدہ موضوع ہے۔

شعور کی رو نفسیات کی ایک اصطلاح ہے جسے ولیم جیمس نے وضع کیا تھا اور تراشا تھا۔ آگ کا دریا میں کہانی کا آغاز ڈھائی ہزار سال قبل کی ہندوستانی تہذیب

سے ہوتا ہے، پھر اس کے بعد مسلمانوں کی آمد ہوتی ہے پھر ایسٹ انڈیا کمپنی کا تسلط ہوتا ہے، پھر یورپ کی تہذیبی بالا دستی آتی ہے، پھر ملک کی تقسیم کا زمانہ آتا ہے، اس پورے تاریخی دور کی تہذیبی عکاسی اس ناول میں کی گئی ہے، یہ تاریخ نہیں ہے لیکن تاریخ کے پس منظر میں کرداروں کو اجاگر کیا جاتا ہے، قرۃ العین حیدر کا ایک سوانحی ناول بھی ہے جس کا نام ہے ''کار جہاں دراز ہے'' اس میں کوئی منظّم پلاٹ نہیں ہے، تاریخی اور تہذیبی تناظر میں بلیغ انداز میں واقعات بیان کیے گیے ہیں، کار جہاں دراز ہے نہ تو پورے طور پر سوانح ہے اور نہ پورے طور پر تاریخ کی کتاب ہے بلکہ ان دونوں کے درمیان میں آنکھ مچولی ہے، قرۃ العین حیدر کو ادب کی دین یہ ہے کہ ان کا اسلوب علامتی طرزِ بیان رکھتا ہے، ان کے تخلیقات کے نام بھی علامتی ہیں، ''میرے بھی صنم خانے'' ''سفینۂ غمِ دل'' ''شیشے کے گھر'' اور ''پت جھڑ کی آواز'' ''آگ کا دریا'' اور ''گردشِ رنگِ چمن'' علامتی رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

قرۃ العین حیدر کے اسلوب کا ایک وصف وہ منظر کشی بھی ہے جو واقعات و تجربات کے پس منظر کا کام دیتی ہے، اور اس میں ایمائیت کا عنصر اپنی جھلک دکھاتا ہے، ان کی تحریروں میں رمزیت، ایمائیت اور علامتی طرز خاص طور پر نمایاں ہے، اور یہ ان کے اسلوبِ بیان کی خصوصیت ہے۔

نسیم حجازی (۱۹۱۴-۱۹۹۶ء)

نسیم حجازی جن کا اصل نام محمد شریف ہے۔ ۱۹/مئی ۱۹۱۴ء کو سوجان پور نزد دھاریوال، ضلع گورداس پور مشرقی پنجاب میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد چودھری محمد ابراہیم محکمہ انہار میں ملازمت کرتے تھے۔ آباواجداد کی ذات آرائیں تھیں جس کی بابت تحقیق سے یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ محمد بن قاسم فاتح سندھ کے ساتھ آنے والے افراد میں آرائیں بھی شامل تھے جن کا حسب ونسب شہید احد حضرت یسار الراعی اور حضرت اسلم اسود الراعی سے جا کر ملتا ہے اور اسی مناسبت سے نسیم حجازی نے اپنے عربی کے استاد غلام مصطفیٰ کے مشورے سے اپنا قلمی نام نسیم حجازی اختیار کیا اور بعد میں اسی نام سے ان کی شہرت ہوئی۔

نسیم حجازی نے ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں سے کچھ فاصلے پر حاصل کی۔ اس کے بعد مزید تعلیم مشن ہائی اسکول دھاریوال ضلع گورداس پور سے حاصل کی۔ میٹرک کا امتحان ۱۹۳۲ء میں پاس کیا۔ بعد ازاں ۱۹۳۸ء میں اسلامیہ کالج لاہور سے بی اے کیا۔ اسی دوران لکھنے لکھانے کا شوق پیدا ہو چکا تھا۔ اپنا پہلا افسانہ ''شودر'' تحریر کیا جو ماہنامہ ''حکایت الاسلام'' میں جنوری ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا۔ اگلے ماہ کے شمارے میں ان کا ایک اور افسانہ ''جستجو'' شائع ہوا۔ انھوں نے اپنے ان دونوں افسانوں

میں ہندو معاشرے میں عدمِ مساوات کے قضیہ کو اجاگر کیا۔ جہاں ایک جیسا جسم رکھنے کے باوجود ذات پات کی بنیاد، انسانوں کو اونچی نیچی ذات میں تقسیم کرتی ہے۔ ہندو معاشرے میں پائی جانے والی اس غیر خدائی تقسیم کا انھیں اتنا کرب تھا کہ انھوں نے اسی موضوع پر اپنا ایک اور افسانہ ''انسان اور دیوتا'' کے نام سے سپرد قلم کیا۔ نسیم حجازی نے اپنی زندگی میں بہت سے نشیب وفراز دیکھے۔ تحریکِ پاکستان کی تائید میں انھوں نے کئی پرزور مقالات سپرد قلم کیے جس کی وجہ سے انھیں بہت سی مشکلات و مصائب کا سامنا بھی کرنا پڑا اور بہت سی تلخ حقیقتوں اور تجربات سے وہ گزرے جس کو انھوں نے اپنے دوناولوں ''پردیسی درخت'' اور ''گم شدہ قافلے'' میں فن کی باریکی اور رنگینی کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض ادبا ان دونوں ناولوں کو ان کی زندگی کے ترجمان قرار دیتے ہیں۔ نسیم حجازی کی شہرت ایک تاریخی ناول نگار کی حیثیت سے مسلم ہے لیکن ان کی عملی زندگی کا آغاز بہ حیثیت صحافی ہوا۔ وہ ابتدا میں کراچی کے روز نامہ ''حیات'' سے منسلک ہوئے۔ اس کے بعد ۱۹۳۴ء سے ۱۹۴۸ء تک ہفت روزہ ''تنظیم'' جو کوئٹہ سے شائع ہوتا تھا اس سے منسلک رہے۔ اسی دوران راولپنڈی سے شائع ہونے والا روزنامہ ''تعمیر'' میں بھی ۱۹۴۰ء سے ۱۹۵۲ء تک ان کے قلم سے نکلی ہوئی تحریریں شاملِ اشاعت رہیں۔ صحافت کے میدان میں ان کا اصل کام اخبار روزنامہ ''کوہستان'' کے حوالے سے یاد رکھنے کے قابل ہے۔ انھوں نے کوہستان کے اڈیٹر کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریاں انجام دیں۔ یہ اخبار بہ یک وقت راولپنڈی، لاہور اور ملتان سے شائع ہوتا رہا۔ مگر یہاں بھی انھیں کچھ ایسے حالات پیش آئے کہ وہ ۱۹۶۶ء میں مجبوراً اس اخبار سے علاحدہ ہوگیے۔

نعیم صدیقی (۱۹۶۱۔۲۰۰۲ء)

جناب نعیم صدیقی ماہنامہ سیارہ پاکستان کے اڈیٹر تھے، وہ بہت بڑے شاعر بھی تھے اور اسی کے ساتھ بہت بڑے ادیب نثر نگار اور صحافی بھی تھے، وہ اردو ادب کی تمام اصناف پر یکساں قدرت رکھتے تھے، شاعری ہو یا افسانہ نگاری، صحافت ہو یا تنقید یا تحقیق ہر میدان میں انھوں نے اپنی فتوحات کے جھنڈے بلند کیے، جب وہ شعر کہنے پے آتے تو ایسا لگتا کہ وہ صفِ اول کے شاعر ہیں، ان کے نصف درجن شعری مجموعے منظرِ عام پر آچکے ہیں، ایک مجموعے کا نام ہے ''شعلۂ خیال'' اور دوسرے مجموعے کا نام ہے ''بارود اور ایمان''۔ انھوں نے نعتیں بھی لکھی ہیں، اور ان کا پورا مجموعۂ کلام بہت بامقصد ہے، نعیم صدیقی کا دل جذبۂ عشقِ رسول (ﷺ) سے معمور تھا، اور اس کا اظہار ان کے کلام ''نور کی ندیاں رواں'' کے اشعار سے ظاہر ہوتا ہے، نعیم صدیقی کے یہاں وفورِ جذبات کے باوجود اعتدال پایا جاتا ہے، نثر میں سیرت کے موضوع پر ان کی تصنیف

''محسنِ انسانیت'' اعلیٰ درجہ کی تصنیف ہے، اور حسنِ زبان وبیان کا بہترین نمونہ ہے، نعیم صدیقی نے افسانوی اور شعری مجموعوں کے علاوہ دیگر تصانیف بھی یادگار چھوڑی ہیں، ان میں ا۔تحریکی شعور ۲۔حق وباطل ۳۔بنیاد پرستی ۴۔سید انسانیت ۵۔ ان کے علاوہ بے شمار چھوٹے چھوٹے کتابچے ہیں جو عصری مسائل میں ہماری رہنمائی کرتے ہیں، جیسے ا۔ ہمہ زندگی ۲۔ بنیاد پرستی ۳۔تحریکی کام کا خاکہ ۴۔تعمیر سیرت کے لوازم ۵۔ کمیونیزم یا اسلام ۶۔ ہندوستان کے فسادات اور ان کا علاج ۷۔اپنی اصلاح آپ پاکستان کے مشہور ادیب وناقد ڈاکٹر تحسین فراقی نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

''جناب نعیم صدیقی کا تعلق ہمارے ان مشاہیر اہل قلم سے ہے جن کی تحریروں میں حیران کن تنوع پایا جاتا ہے، لیکن ان حیران کن تنوع میں ہر جگہ فکر وفرہنگ کی ایک مرکزی رود دوڑتی ہوئی محسوس ہوتی ہے، ان کی ادبی تحریریں ایمان وایقان سے رنگ وآہنگ حاصل کرتی ہیں، ان کی ادبی اور اسلامی تحریریں ادبی محاسن کا بہرۂ وافر رکھتی ہیں''۔

نعیم صدیقی نے ملک نصراللہ خاں عزیز کے اخبار مسلمان کے لیے کام کیا، پھر ۱۹۴۲ء سے رسالہ ترجمان القرآن سے وابستہ ہوئے، ۱۹۴۸ سے ۱۹۵۰ء تک ترجمان القرآن کی ادارت کی ذمہ داری سنبھالی۔اس زمانے میں مولانا مودودی جیل میں تھے، پھر ایک طویل عرصے تک ''چراغِ راہ'' کے مدیر رہے، ۱۹۵۰ء میں ہفت روزہ شہاب جاری کیا، اگست ۱۹۶۲ء میں ادبی ماہنامہ سیارہ جاری کیا جو ہنوز جاری ہے، ان کی کچھ اور بھی معروف تصنیفات ہیں جن کا ذکر مفید ہوگا: ا۔عورت معرض کشمکش میں ۲۔معرکۂ دین وسیاست ۳۔اقبال کا شعلۂ نوا ۴۔معروف ومنکر ۵۔شعلۂ خیال ۶۔ پھر ایک کارواں لوٹا ۷۔ٹھنڈی آگ ۸۔شعاعِ جمال۔ان کی بہت سی تصنیفات بہت مقبول ہیں لیکن ان میں سب سے زیادہ مقبولیت ''محسن انسانیت'' کو حاصل ہوئی، وہ جتنے اچھے نثر نگار تھے اتنے ہی بڑے شاعر بھی تھے، اگر تقابلی مطالعہ کرنا ہو تو ان کی نظم ''یروشلم یروشلم'' کا ان سینکڑوں نظموں سے کیا جاسکتا ہے جن کا موضوع فلسطین ہے، اور فیض احمد فیض جیسے شاعروں نے بھی اس موضوع پر طبع آزمائی کی ہے، لیکن نعیم صدیقی کی نظم ان سب مین ممتاز ہے۔

مولانا ماہر القادری

(ولادت ۳۰ جولائی وفات ۱۲ مئی ۱۹۷۸)

بیسویں صدی میں برصغیر کے تناظر میں جن شخصیات نے علمی ، ادبی اور فکری میدان میں کارہائے

نمایاں انجام دیے ان میں ایک نام مولانا ماہر القادری کا بھی ہے، انھوں نے کچھ عرصے تک حیدر آباد میں بھی قیام کیا جہاں ان کو علمی اور ادبی فضا اور مشاہیر کی صحبت میسر آئی، مولانا ماہر القادری بہت بڑے نثر نگار، نقاد اور زبان وبیان کی نزاکتوں سے واقف تھے، بہترین زبان اور فکر کی بلندی کے سبب علمی اور ادبی فضا پر چھاگیے، حیدر آباد میں رہے تو انھیں قائدِ ملت نواب بہادر یار جنگ کی صحبت میسر رہی، بعد میں وہ مولانا مودودی کی تحریک سے وابستہ ہوگیے، کچھ عرصے انھوں نے بمبئ میں بھی قیام کیا، اور انھوں نے بعد میں ترقی پسند تحریک کی سخت مخالفت کی، اور حلقۂ فکر ونظر کی بنیاد ڈالی، اور اسلامی ادب کا رخ اختیار کیا، جس نے بعد میں منظّم ادبی تحریک کی شکل اختیار کرلی۔

مولانا ماہر القادری اردو زبان کے سچے عاشق وشیدائی تھے وہ زبان کو تہذیب وثقافت کا ایک اہم شعار تصور کرتے تھے، اور وہ زبان کے سلسلے میں کسی بھی قسم کی بے پرواہی اور کوتاہی کو برداشت نہیں کرتے تھے، انھوں نے اپنے ماہنامہ فاران میں سینکڑوں کتابوں پر نقد اور تبصرے لکھے، اور نقد وتبصرہ کا اعلی معیار قائم کیا، اور ان کو زبان اور روزمرہ پر اس قدر قدرت حاصل تھی کہ مشہور ادبا اور اہلِ قلم کی غلطیوں پر بھی گرفت کرتے تھے، وہ جتنے بڑے ادیب اور نقاد تھے، اتنے ہی بڑے شاعر بھی تھے، اردو زبان وادب میں نعتیہ شاعری کی جب بھی کوئی تاریخ لکھی جائیگی ممکن نہیں کہ ماہر القادری کی مشہور زمانہ نعت اور سلام کو نظر انداز کیا جاسکے، جس کا مصرع یہ ہے:

سلام اس پر کہ جس نے بےکسوں کی دست گیری کی

اس مشہورِ زمانہ نعت وسلام کے علاوہ ناول کے انداز میں ان کی سیرت پر کتاب نا قابل فراموش ہے جس کا نام ہے ''درِ یتیم''، ''یادِ رفتگان'' بھی ان کی مشہور کتاب ہے۔ماہر القادری کے تبصروں کو دو ضخیم جلدوں میں ''ماہر القادری کے تبصرے'' کے نام سے شائع کیا گیا ہے۔اس کتاب کے مطالعہ سے زبان وبیان کی رائج غلطیوں کے بارے میں کافی مفید معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

مراجع :

(اردو کے شعراء) اول ودوم (اردو کے ادیب اور نثر نگار) ۱۔آب حیات، محمد حسین آزاد ۲۔تاریخ ادب اردو، سیدہ جعفر ۳ اردو ادب کی مختصر تاریخ، ڈاکٹر انور سدید ۴۔تاریخ ادب اردو، پروفیسر نور الحسن نقوی ۵ مرقع شعراء اردو، محسن حیدر آبادی۔

انشائیہ

تہمتِ مختاری

محمود عالم قریشی

جب ہمیں حلف برداری کا بلاوا آیا تو ہماری خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی اور کیوں نہ ہوتی۔ ہم نے الیکشن لڑنے کی ساری تگ و دو ہی اس خواہش کے ساتھ کی تھی کہ کامیاب ہو کر ہم وزیرِ باتدبیر بن جائیں اور پھر اپنے ناخنِ تدبیر سے ملک وقوم کی الجھی گتھیاں سلجھائیں گے۔ جو ہماری راہ میں رکاوٹ بنے گا ،اسے ہم اپنے لامحدود اختیارات اور غیظ وغضب کی آگ سے بھسم کردیں گے۔ جس سے خوش ہوں گے، اس پر نوازشات کی بارش کردیں گے اور اس کا منہ موتیوں سے بھر دیں گے۔ اب ہمارے خوابوں کی تعبیر کا وقت آ گیا تھا۔ اب ہمارے ہاتھ میں اختیارات ہی اختیارات ہوں گے۔ انھیں ہم لوگوں کی بھلائی کے لیے اس طرح استعمال کریں گے کہ سارے ملک میں نہ سہی ہمارے حلقۂ انتخاب میں ضرور بے مثل ترقی اور خوش حالی کی لہر آ جائیگی۔

رسمِ حلف برداری کے فوراً بعد ہم اپنے رائے دہندگان سے فرداً فرداً مل کر مبارک بادیں وصول کریں گے اور ایک تفاخر کے ساتھ سر کے نامعلوم سے خم کے ساتھ ان کا شکریہ ادا کریں گے۔ لیکن انسان کے سارے خواب پورے نہیں ہو جاتے۔ ہوا یوں کہ رسم کے فوراً بعد ہمیں کچھ ایسے حفاظتی انتظامات میں لے لیا گیا جیسے ہمیں برائے تاوان اغوا کیا جا رہا ہو یا پھر ہم کوئی انتہائی خطرناک مجرم ہوں۔ اپنے رائے دہندگان کے لیے تو بہر حال ہم اغوا ہو ہی گیے تھے اور انھیں غیر معینہ تاوان بھرنے کے لیے چھوڑ دیا گیا تھا۔

انہی حفاظتی انتظامات کے تحت ہمیں ممبرانِ اسمبلی کے ہوسٹل کے کمرہ نمبر چھ میں پہنچا دیا گیا۔ یہ اطلاع بھی دے دی گئی کہ یہ ہماری عارضی قیام گاہ ہے' مناسب بنگلہ کا انتظام ہو جانے پر ہمیں وہاں منتقل کر دیا جائے گا۔ گویا فی الحال ہم تھانہ کی حوالات میں ہیں' یہاں سے جیل بھیج دیئے جائیں گے۔ ہوسٹل کے داخلہ پر پولیس اور خفیہ کے چوکی پہرے کے باوجود ہمارے کمرے کے باہر خصوصی پہرہ لگا دیا گیا۔ ہم حلف اٹھانے اپنے غریب خانہ سے آئے تھے لیکن ہمیں وہاں واپس نہ جانے دیا گیا۔ یوں ہم اپنے گھر والوں اور عزیزوں کی خوشی دیکھنے سے بھی محروم ہوگیے۔ وہ البتہ ٹی وی پر ہماری حلف

برداری دیکھ لیں گے لیکن ان کی آنکھیں ہمیں ہار پھول سے لدے دیکھنے کو ترستی رہیں گی۔

اور تو اور ''ہم'' میں حلف اٹھاتا ہوں ......'' کہہ کر بیٹھے بٹھائے اس گھر کے لیے باعثِ ننگ ہو گیے جس گھر میں ہم نے آنکھ کھولی تھی اور زندگی کی اتنی بہاریں دیکھی تھیں، جس گھر کے چپہ چپہ سے ہماری داستانِ حیات وابستہ تھی، جہاں ہم ایک اکلوتی بیوی کے شاہرِ نامدار و تاجدار ہونے کے علاوہ نصف درجن بچوں کے ابو اور اپنے بزرگوں کے سپوت اور قابلِ فخر فرزند تھے۔ محلے والے بھی ہماری عزت کرتے تھے۔ لیکن اب ہم ان سب کے لیے غیر ٹھہرا دیئے گیے تھے۔

اس حلف میں اللہ جانے کیا تاثیر تھی کہ حکومت کو ہر طرف ہماری جان کے دشمن نظر آنے لگے اور ہماری جان انمول ٹھہری۔ چنانچہ حکومت نے فوراً ہمیں ان نادیدہ دشمنوں سے محفوظ رکھنے کا انتظام کیا۔ حلف اٹھانے سے قبل اس عاجز و مسکین سے کسی کو کوئی پرخاش تھی نہ دشمنی۔ ہماری حفاظت کے لیے ایک کمانڈو قسم کا سفید پوش پستول بردار ہمارے ساتھ نتھی کر دیا گیا۔ ہمیں کچھ دیر بعد احساس ہوا کہ یہ شخص تو حلف اٹھانے جاتے ہوئے بھی ہمارے ساتھ نتھی تھا۔ سرکار ہماری حفاظت کے انتظام کرتے وقت یہ بھول گئی کہ اس سے کہیں زیادہ حفاظتی انتظامات کے باوجود امریکہ کے صدر کنیڈی آنجہانی ہو گیے تھے اور اب کنیڈی ایرپورٹ ان کی یادگار رہ گیا تھا۔ ادھر خلفائے راشدین خصوصاً حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے خلیفہ بغیر کسی پہرہ چوکی کے ایک عالم پر بڑے دبدبے سے حکومت کر گیے۔ بہرحال اس کمانڈو کے علاوہ بھی ہمارے دروازے پر پولیس بٹھا دی گئی تھی۔ اس سے قبل اگر بھولے سے بھی پولیس والا ہمارے غریب خانہ پر آجاتا تو محلے والوں کے کان کھڑے ہو جاتے اور وہ پولیس آنے کی وجہ معلوم کرنے کے لیے ٹوہ میں لگ جاتے، بعض تو براہِ راست ہم سے استفسار کرتے۔

بنگلے کا انتظام ہونے پر ہمیں اور ہمارے خاندان کو وہاں منتقل کر دیا گیا۔ مگر اب ہمارا خاندان سکڑ سمٹ کر ہماری ذات سے باہر ہماری اکلوتی نصف بہتر اور نصف درجن بچوں پر مشتمل رہ گیا تھا۔ یہ بھی غنیمت تھا ورنہ ''بچے دو ہی اچھے'' کے حکومتی اعلان کے مطابق خاندان سے والدین، بہن بھائی کے علاوہ چار بچے بھی خارج ہو جاتے۔ ویسے تو ہمارا خاندان کا تصور وسیع تر ہے۔ ہم تو اس میں والدین کے علاوہ دادا، دادی، نانا، نانی ساس، سسر، تایا، چاچا وغیرہ کو بھی شمار کرنے کے عادی ہیں۔ یہ تو انگریز بہادر تھا جو ہمارے خاندان کو مختصر کر گیا اور قانون میں لکھ گیا کہ خاندان صرف میاں، بیوی اور بچوں پر مشتمل ہوگا۔ اس نے تو یہ بھی نہ سوچا کہ مسلمان کو بیک وقت چار بیویوں کی اجازت ہے، اس نے خاندان میں صرف ایک بیوی شامل کی اور ہمیں حق دے دیا کہ ہم چاروں میں سے کسی ایک بیوی کو خاندان میں لکھوالیں۔ انگریز چلا گیا، اس کا قانون رہ گیا۔ آزادی کے زعم کے باوجود نصف صدی میں بھی ہماری

سرکار کو یہ قانون بدلنے کی توفیق نہ ہوسکی۔ خیر! ہمارا خاندان تو اس بنگلہ میں سما گیا مگر اس فرنیچر، قالین، پردوں اور دیگر سامانِ آرائش کے لیے کوئی گنجائش نہ ہوسکی جو ہم نے بڑے شوق اور زرِ کثیر سے ذاتی مکان میں فراہم کیا تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان چیزوں کے لیے یہ بنگلہ چھوٹا تھا بلکہ اس کی شان ہمارے سامان کی شان سے چھوٹی تھی تاہم اس قسم کی تمام چیزیں سرکار نے یہاں فراہم کردی تھیں۔

جو بے پناہ اختیارات ہمیں حاصل ہوئے تھے ان میں اپنا پرائیویٹ سکریٹری منتخب کرنا بھی شامل تھا۔ ہم نے سوچا یہ تو اچھی بات ہے، ہم اپنے بھروسے کا رازدار آدمی رکھ لیں گے۔ اس طرح ہمارے راز اور کمزوریاں فاش ہونے سے بچ جائیں گی۔ چنانچہ ہم نے ان صفات کے حامل ایک شخص کو منتخب کیا اور اس کی تقرری کا پروانہ فوری طور پر جاری کرنے کی ہدایت سکریٹری وزارت کو ارسال کردی۔ تھوڑی دیر بعد وہ فون پر ہم سے حاضری کی اجازت طلب کر رہا تھا، ہم نے ازراہِ مراحمِ خسروانہ اسے اجازت دے دی۔ اس نے آتے ہی وہ ہدایت ہمارے سامنے رکھتے ہوئے عرض کیا کہ ہمارا اختیارِ انتخاب اس فہرست تک محدود ہے، جس میں تقرری کے منتظر پرائیویٹ سکریٹریوں کے نام اسٹبلشمنٹ ڈویژن دیتے ہیں۔ ہم اس فہرست میں شامل کسی شخص سے یا اس کی کارکردگی سے واقف نہ تھے۔ لہذا یہ انتخاب سکریٹری کے مشورے سے ہوا بلکہ دراصل یہ ہمارا نہیں انہی کا انتخاب تھا۔ وہ صاحب ہمارے پرائیویٹ سکریٹری بن کر آگیے۔ اپنے راز کو راز رکھنا اور اپنی کمزوریوں کی پردہ پوشی ہماری ذاتی ذمہ داری ٹھہری۔

حلف برداری کے بعد جناب صدر اور وزیرِ اعظم نے بھی ہمیں آگاہ کردیا تھا کہ جن محکموں کا قلمدان ہمیں سونپا گیا ہے ان کی اچھائی برائی، حسنِ کارکردگی، بدعملی، غفلت و نااہلی کے ہم ذاتی طور پر ذمہ دار ہوں گے۔ ہماری قلمرو میں کسی چپراسی سے بھی کوتاہی سرزد ہوگی تو ذمہ دار ہم ہوں گے۔ منطق عجیب ہے، کرے کوئی بھرے کوئی۔ مگر بات ہمارے دل لگتی تھی کیونکہ ہم تو یہ ارداہ کر کے ہی آئے تھے کہ ایک ایک کو درست کردیں گے، کام کی رفتار بڑھادیں گے، بدعنوانی اور رشوت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکیں گے۔ چنانچہ ہم نے وزارت کے تمام افسروں اور محکموں کے سربراہوں کو ایک وقت مقررہ پر کمیٹی روم میں جمع ہوکر اپنا خطابِ بلاغت نظام سننے کی ہدایت کردی۔ اس ہدایت کے جاری ہوتے ہی پرائیویٹ سکریٹری نے بتایا کہ پی آر او شرفِ باریابی چاہتا ہے۔ اس نے آتے ہی تعارف کے بعد افسران سے ہمارے مجوزہ خطاب کے بارے میں استفسار شروع کردیا۔ ہم نے کہاں میاں تم کیوں فکرمند ہوتے ہو، خطاب ہم کریں گے۔ جو جی چاہے گا، ڈنکے کی چوٹ پر کہیں گے، تم بھی آکر سن لینا۔ اس نے دست بستہ عرض کیا کہ ہماری تقریر لکھنا اور اس کی پبلیسٹی کرنا اس کا فرض ہے، ہم بس اپنا مدعا بتادیں، جس کو ایسے الفاظ کا جامہ پہنادے گا کہ اخبار والے کوئی گرفت نہ کرسکیں۔ ہم نے اسے خاص خاص نکات بتا دیئے۔

وقت مقررہ پر اس کی لکھی ہوئی تقریر کے الفاظ ہم نے اپنی زبانِ گوہر بار سے اگل دیئے۔ مشکل الفاظ ادا کرنے میں دشواری ضرور ہوئی اور ایسے مواقع پر تلفظ کی غلطیاں بھی سرزد ہوئیں۔ جب ہم نے کہا کہ کوئی بدعنوان' بدکردار اور رشوت خور افسر یا کارندہ برداشت نہیں کیا جائے گا' اس کا سخت محاسبہ ہوگا تو بعض کے منہ لٹک گیے' چہروں پر زردی چھاگئی اور بعض کے ہونٹوں پر زہر خند مسکراہٹ آگئی' کانا پھوسی بھی ہوئی۔ ہم دیکھتے رہے اور سوچتے رہے کہ جب ہم گرفت کریں گے تو یہ مسکراہٹ آہ و زاری میں بدل جائے گی۔

عوام سے کیے ہوئے وعدوں پر عمل پیرا ہوتے ہوئے ہم نے اپنے محکموں کے خلاف شکایات وصول کرنا شروع کردیں۔ ہر شکایت کی تحقیق خود کرنا مشکل تھا لہذا ہم مجبور تھے کہ سکریٹری سے رپورٹ طلب کریں۔ جو رپورٹیں ہمارے پاس آئیں وہ کچھ اس قسم کی تھیں: ''جانچ پڑتال کے بعد شکایت بے بنیاد پائی گئی''۔ ''شکایت ذاتی مخاصمت پر مبنی ہے''۔ ''شکایت کنندہ عائد کردہ الزامات کا ثبوت فراہم نہ کرسکا''۔ ''شکایت کا ازالہ کردیا گیا ہے''۔ ''متعلقہ افسر کو تنبیہ کردی گئی ہے آئندہ محتاط رہے''۔ یہ سلسلہ کچھ عرصہ یونہی چلتا رہا اور ہم باور کرنے لگے کہ ہماری توجہ سے ہمارے ماتحت تمام محکمے بدعنوانی اور رشوت سے پاک ہوگیے ہیں۔

بعض سنگین نوعیت کی شکایات ہم نے ایف آئی اے اور سی آئی اے کے سپرد بھی کیں۔ ان کی رپورٹ مدتوں بعد آئی کہ الزامات کا کوئی ثبوت نہیں مل سکا۔ شکایت کنندہ اور ہم سر پکڑ کر رہ گیے۔ پھر ہم نے محکموں کا معائنہ شروع کیا بلکہ بغیر اطلاع ان پر چھاپے مارے۔ ایک موقع پر ہم نے سربراہِ محکمہ کو رشوت لیتے رنگے ہاتھوں پکڑلیا۔ ایک اور کو رقص و سرود کی محفل جمائے مئے ناب سے شغل فرماتے پکڑا۔ ہم نے دونوں کو کھڑے گھاٹ معطل کردیا اور ان کے خلاف ضابطہ کی کارروائی شروع کرادی۔ دونوں نے ہمارے حکم کے خلاف عدالت سے رجوع کیا۔ عدالت نے ہمارے احکامِ معطّلی کو غیر قانونی قرار دیتے ہوئے انھیں نہ صرف بحال کردیا بلکہ ضابطہ کی کارروائی بھی کالعدم قرار دے دی۔ ہم محتاط ہوگیے اور آئندہ ایسے لوگوں کے متعلق اپنی معائنہ رپورٹ میں معطّلی کی سفارش کی۔ ان کے خلاف ضابطہ کی کارروائی ہوئی' کچھ سزا بھی ملی۔ اپیل میں پھر عدالت سے یہ حکم صادر ہوا کہ معطّلی ہماری سفارش پر ہونے کی وجہ سے غیر قانونی اور کالعدم ہے۔

ہمارے دوست احباب جو وقت بے وقت ہم سے مل لیا کرتے تھے' اب فون پر بھی ہم سے بات کرنے کو ترسنے لگے' عوام کی تو ہم تک رسائی ہی ناممکن ہوگئی۔ ادھر ہم نے بھی اپنی مقبولیت کو زنگ لگتے محسوس کیا۔ چنانچہ ہم نے پی۔آر۔او کو طلب کیا اور اپنی مشکل اس پر آشکار کرتے ہوئے معقول حل تلاش کرنے کی ہدایت کی۔ اس نے جگہ جگہ ہماری کھلی کچہری کا اہتمام کیا۔ یہ ضروری نہ تھا کہ کچہری ہمارے حلقۂ انتخاب ہی میں ہو۔ کبھی کچہری کھلے آسمان تلے لگتی اور کبھی قناتوں اور

شامیانہ کے زیرِ سایہ جہاں ہم اپنی اونچی سی مسند پر بیٹھ کر درخواستیں وصول کرتے، ان پر احکام صادر فرماتے۔ عوام چاروں طرف سے ہجوم کرتے مگر اہتمام یہ رہتا کہ ٹی وی والے کچہری کی کارروائی کی فلم بآسانی بنا سکیں۔ افسرانِ علاقہ ہمارے دائیں بائیں ہوتے۔ ہمارے اور عوام کے درمیان کشادہ جگہ ٹی وی والوں کی فلم سازی کی سہولت کے لیے چھوڑ دی جاتی جس کی حد بندی رسیوں سے کردی جاتی۔ ان رسیوں کے اس طرف عوام ہوتے۔ ان کے درمیان ایک چارفٹ کا راستہ چھوڑا جاتا جو سرخ قالین سے مزین ہوتا جس پر ہم قدم رکھتے دائیں بائیں عوام کا سلام لیتے، نعروں پر اظہارِ مسرت کرتے مسند تک پہنچتے۔

ایک روز ہمارے ایک منہ پھٹ دوست نے ہماری کھلی کچہری کے متعلق کچھ ایسے انکشافات کیے کہ ہم اس سے دست کش ہوگیے۔ آپ سے کیا پردہ! اس نے بتایا کہ ہمارے چہار طرف ہجوم کرنے والے عوام نہیں سفید پوش پولیس والے ہوتے ہیں یا ان کے چہیتے۔ اصل عوام تو ایک فاصلہ پر درخواستیں پکڑے منتظر رہتے ہیں مگر ان میں سے صرف چیدہ چیدہ افراد کو آگے آنے دیا جاتا ہے۔ نیز ان مواقع پر چائے پانی اور شامیانہ کے مصارف کسی سرکاری فنڈ سے نہیں آتے بلکہ علاقہ کے معززین کے ذریعے عوام ہی سے وصول کیے جاتے ہیں۔

دفتر میں عوام اور ہمارے درمیان تین دیواریں حائل تھیں: استقبالیہ، ہمارا اردلی اور پی ایس (پرائیویٹ سکریٹری) جو ان تینوں کو دامے درمے یا خوشامد سے راضی کرلیتا وہ ہم تک پہنچ جاتا۔ بعض تمام حربے استعمال کرکے بھی ہم تک نہ پہنچ پاتے۔ پی ایس ان کی عرض داشتیں ہمارے حضور پیش کرنے کے لیے لے لیتا۔ بعد میں پی ایس کے نوٹ کے ساتھ یہ ہمارے سامنے آتیں، ہمارا کام صرف ایسے نوٹس پر توثیقی دستخط ثبت کرنا تھا۔ گویا حکم پی ایس کا ہوتا اور ہم اس پر ''قلم''، تسلیم خم کرتے۔ لوگ اپنی عرض داشتوں کا نتیجہ معلوم کرنے کے لیے ہمارے دفتر اور در کے چکر لگاتے رہتے۔ ان کے ازدحام سے ہماری مقبولیت کو چار چاند لگتے رہتے۔

ایک صاحب نے بالمشافہ درخواست گزاری کہ کئی سال سے پٹواری ان کی آبائی زمین ان کے نام منتقل نہیں کررہا۔ اسے حکم دیا جائے کہ فوراً انتقالِ اراضی کرے۔ ہم نے انھیں ہزار ہزار سمجھایا کہ جناب یہ معاملہ صوبائی ہے اور ہم مرکزی وزیر، مگر وہ بضد تھے کہ مرکز بڑی شے ہے۔ ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں ہوتا ہے۔ نیز ہمیں اختیاراتِ کلی حاصل ہیں۔ اس صورت حال پر پی ایس نے ہمارے کان میں پھونکا اور ہم نے بغیر کچھ لکھے درخواست پر دستخط کیے اور سی ایم (چیف منسٹر) کو مارک کردی۔ اب وہ صاحب وزیرِ اعلیٰ متعلقہ کے دفتر کے چکر کاٹنے کے لیے چھوڑ دیئے گیے۔

بعض لوگ ایسے چھوٹے چھوٹے مسائل لے آتے

کہ خود ہمیں شرم آجاتی۔ مثلاً بچے کو کالج میں داخلہ دلا دیں۔ دریافتِ حال پر معلوم ہوا کہ صاحبزادے تھرڈ ڈویژن کی وجہ سے داخلے سے محروم رہے' یا بیٹا دیہات میں تعینات ہے اس کا تبادلہ شہر میں کرادیں۔ فلاں افسر بہت سخت گیر ہے اور تنگ کرتا ہے اس کا تبادلہ کردیں۔ درخواست گذار کبھی یہ نہ سوچتا کہ متعلقہ محکمہ ہماری قلمرو میں ہے بھی یا نہیں۔ نسخہ ہمارے ہاتھ آچکا تھا' ہم کسی درخواست کو وزیرِ اعلیٰ کی طرف روانہ کردیتے اور کسی دوسرے وزیر کی جانب۔ ہم جانتے تھے کہ مسئلے کا اصل حل یہ نہیں۔

یہ سب کچھ تو تھا اور کاروبارِ وزارت بھی ٹھیک ٹھاک تھا مگر ہماری ''مشہوری'' (پبلیسٹی) کو زنگ لگتا جارہا تھا۔ اس خسارے کو محسوس کرکے ہم نے پی آر او کو زحمت دی اور شاندار ''مشہوری'' کا مجرب نسخہ دریافت کرنے کا حکم دیا۔ دو تین دن بعد ہم ایک گرلز کالج کے جلسۂ تقسیمِ اسناد میں مہمانِ خصوصی تھے' صدارت ڈائریکٹر تعلیمات کررہے تھے۔ اسناد اور انعامات ان ہی نے تقسیم کرنے تھے مگر ہماری خاطر وہ اپنے اس اعزاز سے دست بردار ہوگیے۔ وہ پرنسپل سے سند و انعام لے کر ہمیں پکڑاتے اور ہم طالبات کو دیتے رہے۔ ٹی وی کے لیے ہماری فلم بنتی رہی بلکہ ہمارے استقبال اور ہار پہنائے جانے کی فلم بھی بنی' ہم اس دوران مسکراہٹیں بکھیرتے رہے۔ وقفہ وقفہ سے ہم اس قسم کی تقاریب میں مہمانِ خصوصی بنتے رہے اور اپنی ''مشہوری'' کرتے رہے۔ تقریب کبھی کالج میں' کبھی اسکول میں۔ کبھی تقسیمِ اسناد' کبھی مباحثہ کی صدارت' کبھی سالانہ کھیلوں کے مقابلے کا افتتاح ہوتا رہا۔ کبھی کبھی ہمارا ضمیر کچوکا دیتا کہ تم میٹرک فیل کس منہ سے کالجوں اور دیگر تعلیمی اداروں کے علمی مباحثوں کی صدارت کرتے ہو۔ لیکن ہم نے اسے یہ کہہ کر خاموش کردیا کہ ہماری کوالیفیکیشن ایم ایف ہے۔

ہمارا قلمدانِ وزارت تجارت پر مشتمل تھا۔ اور تجارت پر متعدد پابندیاں عائد تھیں۔ فلاں فلاں اشیاء (تمباکو' افیم' چرس) کی خرید و فروخت کے لیے لائسنس کی پابندی' دساور سے مال منگانے اور وہاں لے جانے کے لیے لائسنس' اور ہم آزادی کے علم بردار۔ چنانچہ ہم تجارت پر سے تمام پابندیاں اٹھالینا چاہتے تھے۔ لہذا ہم نے سکریٹری کو طلب کرکے حکم دیا کہ فوراً ان تمام پابندیوں کو اٹھانے کا حکم جاری کرے۔ وہ بیچ میں پالیسی کو گھسیٹ لائے اور ہمیں قائل کرنے لگے کہ ایسا نہیں ہوسکتا' یہ حکومتی پالیسی کا معاملہ ہے۔ ہم نے کہا' اگر پابندیاں لگائی جاسکتی ہیں تو اٹھائی بھی جاسکتی ہیں۔ پالیسی بھی تبدیل ہوسکتی ہے۔ اس نے پھر حجت کی کہ پالیسی تبدیل کرنے کی منظوری لینا پڑے گی۔ ہم تنک کر بولے ''ہم نے منظوری دے دی''، انھوں نے عرض کیا' جناب یہ تو کابینہ دے گی۔ ہم بولے ''کوئی بات نہیں' کل کابینہ کا اجلاس ہے ہم اس میں منظوری لے لیں گے''۔ وہ پھر عرض پرداز ہوئے کہ یہ کام زبانی نہیں ہوتا۔ اس کے لیے ایک سمری وزیرِ اعظم کی منظوری کے لیے

جائے گی'اس کے بعد ایک اور سمری کابینہ کے حضور پیش ہوگی۔ اگر وہ منظور ہوگئی تو پالیسی تبدیل ہوجائے گی۔ ہم نے جلد از جلد سمری تیار کرنے کا حکم صادر کیا۔ سمری بنی اور وزیرِ اعظم کو ایسی گئی کہ پھر اس کی خبر نہ ملی۔

اس مرحلے کے بعد ہم نے دستور کا بغور مطالعہ کیا تاکہ اپنے اختیارات کا کما حقہ علم ہوجائے۔ وہاں ہمارا ذکر صرف اس حد تک تھا کہ وزیرِ اعظم اپنی صوابدید پر چند وزراء کی ایک کابینہ تشکیل دیں گے اور ہر وزیر اس وقت تک وزیر ہوگا جب تک وہ چاہیں' گویا ہماری نوکری سوہنی کے گھڑے سے بھی کچی تھی۔ اپنے قلمدان کی ساری ذمہ داریاں ہماری تھیں لیکن ہم کوئی کام وزیرِ اعظم کی منظوری کے بغیر نہیں کر سکتے تھے۔ پھر ہم کس کام کے وزیر تھے۔ بس یہیں سے وزارت سے ہماری بیزاری کی ابتداء ہوگئی۔

تاہم ہمیں اپنے حلقۂ انتخاب کی فلاح و بہبود کی فکر تھی۔ یہاں دیہات بجلی کی روشنی سے یکسر محروم تھے۔ ارادہ تو ہمارا تمام دیہات کو بجلی فراہم کرنے کا تھا لیکن ابتداء کسی ایک گاؤں ہی سے ہوسکتی تھی۔ چنانچہ ہم نے سو گھروں پر مشتمل ایک گاؤں کا انتخاب کیا اور واپڈا کو وہاں بجلی فراہم کرنے کا نادر شاہی حکم دیا۔ واپڈا نے بہت حیلے بہانے کیے۔ مثلاً دو فرلانگ سے لائن لانا پڑے گی۔ کھمبے نصب کرنے ہوں گے وغیرہ وغیرہ۔ ہم نے وزیرِ اعظم سے بھی تائیدی حکم جاری کرا دیا۔ پھر بھی تاخیر ہو رہی تھی۔ لہٰذا ہم نے واپڈا پر دباؤ بڑھانے کے لیے اس گاؤں میں فراہمی بجلی کے افتتاح کی تاریخ اور وقت کا اعلانِ عام کر دیا اور پی-آر-او کو واپڈا کے پیچھے لگا دیا کہ مقررہ وقت تک وہاں بجلی پہنچ جانا چاہئے۔ معلوم ہوا کہ اتنے تنگ وقت میں بانس کھڑے کر کے عارضی لائنیں ڈالی جاسکتی ہیں' بعد ازاں ضروری کھمبے نصب کر کے تاریں ان پر منتقل کر دی جائیں گی۔ عندالوقت تکمیلِ کار کے خیال سے ہم نے اس کی منظوری دے دی۔ چنانچہ سب انتظام بروقت ہوگیا اور ٹی وی کیمروں کی آنکھوں کے سامنے مجمعِ عام میں ہم نے مین سوئچ کھول کر اس کے اوپر لگے بلب کو روشن کر دیا۔

ہفتہ بھر بعد ہم گاؤں والوں کے تاثرات بالمشافہ معلوم کرنے کے لیے چپکے سے وہاں جا پہنچے۔ ہمیں اپنی آنکھوں پر اعتماد نہیں آ رہا تھا۔ ہم بار بار آنکھیں ملتے' عینک کے شیشے صاف کرتے اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے۔ وہاں وہ سب بانس غائب تھے' تاروں کا کوئی وجود نہ تھا اور گاؤں حسبِ سابق تاریکیوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ ہم گاؤں والوں سے نظریں چراتے' منہ چھپاتے وہاں سے الٹے پاؤں لوٹ آئے۔

اپنے احکام اور تدبیر کا یہ حالِ زار دیکھ کر ہماری ہمت جواب دے گئی۔ ہم نے بیوی بچوں کو اپنے ذاتی مکان بھجوا دیا اور صرف چند فائلوں اور سمریوں پر دستخط کرنے کا اتنا بڑا معاوضہ ٹھکراتے ہوئے باقائمی ہوش و حواس اپنا استعفٰی صدرِ مملکت کی خدمت میں پیش کیا اور گھر آگیے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

غزل

حآمد یزدانی

ہوا نے کان میں یہ کہہ دیا کیا
ہوئی آوارہ ' خوشبو کیا ' صبا کیا

نہ ٹھہریں جس کے چہرے پر نگاہیں
مقابل اس کے ٹھہرے آئنا کیا !

نظر پر چھا رہی ہے دُھند کیسی
بسا ہے آنکھ میں یہ خواب سا کیا

ہوا کے دوش پر آیا تھا کوئی
قدم اُس کے میں بڑھ کر روکتا کیا

بہت ہی سوچ کر بُھولا تھا جس کو
اُسے میں دیکھ کر پہچانتا کیا

مقابل ایک دیوارِ اَنا ہے
بڑھے گا خواہشوں کا قافلہ کیا

میں آئینہ ہوں ' سب کو جانتا ہوں
مجھے حآمد، کوئی پہچانتا کیا

غزل

حامد یزدانی

مسافروں کو غمِ رفتگاں پُکارتا ہے
پسِ غبار کوئی کارواں پُکارتا ہے

نفس نفس میں بھٹکتی ہے ایک وحشت سی
یہ کون ہے جو سرِ دشتِ جاں پُکارتا ہے

سرِ مژہ مرے اشکوں کی دُھند پھیل گئی
ورائے غم، کوئی زخمِ نہاں پُکارتا ہے

سفید نیند سے پُھوٹی ہے زرد سرگوشی
کہ کُنجِ خواب سے تُو رائیگاں پُکارتا ہے

سوادِ ہجر پہ حرفِ زیاں کا پہرہ تھا
بچھڑنے والوں کو رستہ کہاں پُکارتا ہے

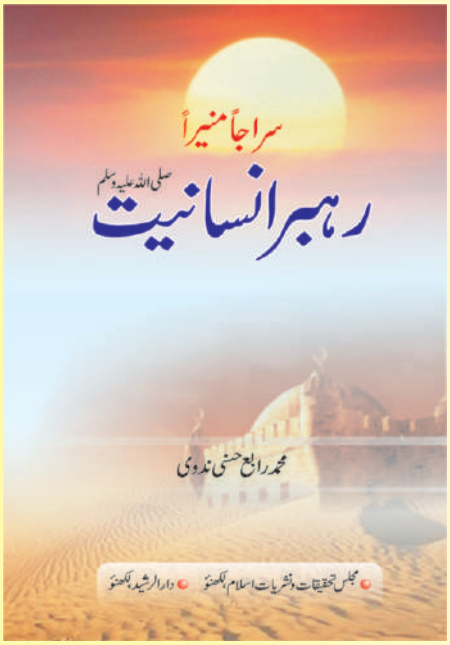

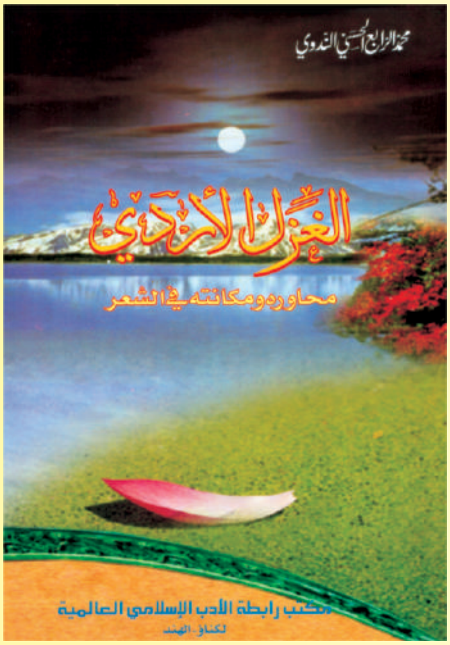

Designed by : Mashhud (Mashhud Enterprises) #9235794786, 9208375733
Printed at : Parekh Offset Printing Press #9839133588